رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۲۰

جلد ۳۵
عدد ۲

صفر ۱۳۷۰ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

دین کی بنیادی تعلیمات سے آگاہی

ریاست پاکستان کے ہر شہری کا اولین فریضہ ھے

رسالۂ دینیات

اس رسالے میں ابتدائی دینی تعلیم کے لئے نیا انداز اختیار کیا گیا ھے۔ فقہی مسائل کی تفصیلات کے بجائے دین کے بنیادی عقائد اور ان کی صحت و صداقت کے دلائل ترتیب کے ساتھ بیان کئے گئے ھیں، کیوں کہ عقائد کے استحکام کے بعد ھی جزوی احکام میں اطاعت کا جذبہ بیدار ھوسکتا ھے۔

ضخامت ۱۱۲ صفحات ۔ قیمت ۱/۸

خطبات

یہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد سے متعلق انتیس خطبوں کا مجموعہ ھے۔ زبان اور انداز بیان دونو نہایت سلیس اور عام فہم ھیں، ان خطبوں میں احکام وعبادات کی حکمت اور اُن کے مصالح ذھن نشین کرانے کی خاص طور پر کوشش کی گئی ھے۔ رسالۂ دینیات کے ساتھ خطبات کے مطالعہ سے دین کی راہ اچھی طرح روشن ھوجاتی ھے۔

ضخامت ۲۱۶ صفحات ۔ قیمت ۳/-

تجدید و احیاء دین

تجدید اسلام کے موضوع پر یہ ایک تاریخی اور اصولی بحث ھے۔ اس میں اسلام اور جاھلیت کی اصولی کشمکش کا جائزہ لینے کے بعد تجدید کی حقیقت، مجدد کی تعریف اور اس کے کام کی نوعیت متعین کی گئی ھے۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبد العزیز سے لے کر حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید تک کے مجددین کے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ھے۔

ضخامت ۸۰ صفحات ۔ قیمت ۱/-

تفہیمات

(حصہ اول)

اس میں اسلام کے بعض اُن اہم ترین مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ھے جن کا تصور عام طور پر محدود یا مسخ ھوکر رہ گیا ھے۔ مثلاً عبادت، جہاد، آزادی، روا داری وغیرہ۔ کتاب کے آخر میں خصوصیت کے ساتھ توحید رسالت، اتباع رسالت اور ماخذ دین ھونے کی حیثیت سے حدیث کی اھمیت پر بحث کی گئی ھے۔ حدیث کے متبعین اور منکرین دونو کے لئے اس بحث کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ھوگا۔ کتاب کا حصہ دوم زیر طبع ھے۔

ضخامت ۳۲۴ صفحات ۔ قیمت ۳/۸

☆

تنقیحات

اس تالیف کے مضامین اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر لکھے گئے ھیں۔ ان میں غیر اسلامی اثرات اور مسلمانوں کی کوتاھیوں پر تنقید بھی ھے اور الجھے ھوئے حقائق کی تنقیح بھی۔ موجودہ تہذیبی دور میں تعلیم یافتہ اذھان جن پیچیدگیوں سے دوچار ھیں۔ انہیں صاف کرنے میں اس کتاب سے بہت مدد مل سکتی ھے۔

ضخامت ۲۱۲ صفحات ۔ قیمت ۲/۸

ترجمان القرآن

فہرستِ مضامین

جلد ۳۵ | صفر ۱۳۷۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۰ء | عدد ۲

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

تحریکِ اسلامی کے پہلے مرحلے میں کیا کام کس طرح کیا گیا، اور پھر دوسرا مرحلہ جس طرح جن حالات میں شروع ہوا اس کی تشریح پچھلی اشاعت میں کی جا چکی ہے۔ اس بحث کو اگر آپ نے بغور پڑھا ہے۔ تو اس سے دو باتیں آپ پر واضح ہو گئی ہوں گی۔

ایک یہ کہ اول روز سے ہمارے پیشِ نظر ایک ایسی اجتماعی جدوجہد برپا کرنا تھا جو خالص اصولی حیثیت سے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے اور اس دین کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کی سعی کرے۔ ہمارے نزدیک یہی کام امت مسلمہ کا اصل مقصد وجود تھا اور ہماری تشخیص یہ تھی کہ دنیا کے تمام بگاڑ، اور مسلمانوں کے عالمگیر تنزل، اور خود برِّ عظیم ہند میں مسلمانوں کی قومی مشکلات کی حقیقی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس امت نے وہ کام چھوڑ رکھا ہے جس کے لئے دراصل اس کو پیدا کیا گیا تھا۔ اس غرض کے لئے ہم اپنی کوئی الگ جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہماری خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس چیز کا صحیح احساس پیدا ہو، وہ پہلے خود اسلام کو سمجھیں، پھر اس کے بارے میں اپنے فرض کو پہچانیں، اور پھر قومی حیثیت سے دوسرے مشاغل کو چھوڑ کر اپنی ساری قوت اور اپنی ساری توجہ اپنے دین کی دعوت اور اقامت پر مرکوز کر دیں۔ ہمیں یقین تھا کہ صرف یہی ایک صورت ہے جس سے مسلمان اپنی مشکلات کو بھی دور کر سکتے ہیں اور دنیا کی مشکلات کا بھی صحیح حل پیش کر کے اقوامِ عالم کے امام بن سکتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہم نے جماعت اس وقت بنائی جب ہماری ۹ سال کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے باوجود مسلمانوں نے من حیث القوم اُس راہ کو اختیار نہ کیا جسے ہم پیش کر رہے تھے، جب مسلمانوں کی تمام موجود الوقت جماعتوں نے اسے اپنی اجتماعی سعی کی راہ بنانے سے احتراز کیا، اور جب تقسیمِ ہند مسلمانوں کی قومی پالیسی قرار پا گئی جس کے نتیجے میں لازماً آدھے مسلمان یرغمال کے طور پر ہندو قوم پرستی کے حوالے ہو جانے والے تھے اور بقیہ آدھے مسلمانوں کو

ایک ایسی قومی ریاست میسر آنے والی تھی جس کا ایک حقیقی اسلامی ریاست میں تبدیل ہونا کم از کم اس کے بانیوں اور لیڈروں کی سیرت و کردار کو دیکھتے ہوئے) سخت مشتبہ نظر آتا تھا۔ ان حالات میں ہم نے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے اندر جو مٹھی بھر افراد ایسے موجود ہیں جنھوں نے ہماری دعوت کو سمجھا اور دل سے قبول کیا ہے انھیں لے کر جلدی سے جلدی منظم کر لیا جائے اور ان کی تربیت کا کام شروع کر دیا جائے تاکہ ایک ایسا گروہ تیار ہو جو ایک طرف قومی اغراض سے بالاتر ہو کر خالص اقامتِ دین کی سعی کر سکے، اور دوسری طرف اُن حالات کا مقابلہ کر سکے جو تقسیم ہند کے بعد پیش آتے نظر آرہے تھے۔

اس دوسرے مرحلے کو ہم تنظیم و تربیت کا مرحلہ کہتے ہیں۔ مگر یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ کسی تحریک کو مراحل میں تقسیم کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ایک مرحلہ کا کام دوسرے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے ختم ہو چکا ہوتا ہے اور پھر بعد کے مراحل میں اسے جاری نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مرحلے میں پہلے مرحلے کے کام کو جاری رکھتے ہوئے کچھ مزید کام بھی شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ تشکیل جماعت کے بعد تنظیم و تربیت کے پروگرام کو شروع کرنے کے ساتھ ہم نے تنقید و تعمیر اور تبلیغ و دعوت کے کام کو اسی طرح مسلسل جاری رکھا جس طرح وہ ابتدا سے ہوتا چلا آرہا تھا۔ اس دور میں جو چیزیں شائع کی گئیں ان کو بھی اگر ناظرین تاریخی ترتیب کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں تو انھیں اُس نقشے کو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوگی جس پر ہم اس دعوت کو آگے بڑھا رہے تھے:

؁۴۲ - ؁۴۱، تفہیم القرآن، رسائل و مسائل کے بیشتر مضامین۔

؁۴۲، سلامتی کا راستہ

؁۴۳، دین حق، اسلام میں قتل مرتد کا حکم۔

؁۴۴، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر، حقیقت شرک۔

؁۴۵، حقیقت توحید، اشتراکیت اور نظام اسلام۔

؁۴۶، شہادتِ حق۔

سنہ ۴۴ء، جماعت اسلامی کی دعوت، بناؤ اور بگاڑ، حقیقت تقویٰ۔

ان مطبوعات کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہو سکتی ہے کہ اس مرحلے میں دین کی بنیادی دعوت اور اس کے عملی نظام کی تشریح و توضیح کا کام پہلے مرحلے سے بھی کچھ زیادہ وسعت کے ساتھ انجام دیا گیا اور سنہ ۴۴ء کے وسط تک پہنچتے پہنچتے ایک ایسا وسیع لٹریچر اس ملک کی تعلیم یافتہ آبادی کے لئے فراہم کر دیا گیا جس میں وہ اسلامی نظام زندگی کے قریب قریب ہر گوشے کی شکل و صورت قابلِ فہم طریقے سے دیکھ سکتی تھی۔ جماعت کی تنظیم و تربیت کا کام اس پر مستزاد تھا، نہ یہ کہ دعوت کو چھوڑ کر اس مرحلے میں صرف جماعت کی تیاری پر ہی سارا وقت صرف کیا گیا ہو۔

اب ہم ذرا وضاحت کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس جماعت کی تاسیس کے وقت کیا مقصد ہمارے پیشِ نظر تھا، کس قسم کے آدمی ہم تیار کرنا چاہتے تھے اور ان سے کیا کام لینا مطلوب تھا۔ اس غرض کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کوئی نئی تشریح و توضیح کرنے کے بجائے انہی عبارات کو پھر ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے جن میں ابتداءً جماعت کے مقصدِ تاسیس کو بیان کیا گیا تھا۔

تشکیل جماعت سے چار مہینہ قبل اپریل سنہ ۴۱ء میں، انہی صفحات میں ایک مضمون لکھا گیا تھا جو ہماری کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں "ایک صالح جماعت کی ضرورت" کے عنوان سے درج ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کے بعد کہ شرک، رہبانیت اور مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب، ہر ایک کی ناکامی کے بعد اب دُنیا کا مستقبل صرف ایک ہی نظریہ کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ اسلام کا نظریہ ہے، عرض کیا گیا تھا:

"لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دُنیا بس مفتوح ہونے کے لئے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لئے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ، سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے .... دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرت سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ

جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع بنیں، جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اسے خود چھوڑیں۔ پھر اُن کو اِس فاسد نظام تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا، اُن تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور امیدوں کو جو اِس نظام سے وابستہ ہوں چھوڑنا ہوگا، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں، اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انھیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقاتِ عزیزہ بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، قید اور جلاوطنی اور ضبطِ اموال اور تباہی اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا ...... زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے اپنے بہتے ہوئے پسینے سے اور اپنی جفاکشی سے اُس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اگلنے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔"

تشکیل جماعت کے ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۴۲ء میں دربھنگہ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جو تقریر کی گئی تھی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"ہمارے لئے خارج سے بڑھ کر باطن اہمیت رکھتا ہے۔ اس وجہ سے محض تنظیم اور محض ایک چھوٹے سے ضابطہ بند پروگرام پر لوگوں کو چلانے اور عوام کو کسی ڈھرے پر لگا دینے سے ہمارا کام نہیں چلتا۔ ہمیں ایک عوامی تحریک چلانے سے پہلے ایسے آدمی تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی

رکھتے ہوں کہ تعمیر افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دوہرے فرائض سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لئے جلدی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متأثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لئے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیب و تمدن کے معمار بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشے کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لئے مدتِ مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیشِ نظر کام کا جو نقشہ ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لئے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیرکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعے سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔ ایک ٹھوس، پائیدار اور ہمہ گیر انقلاب کا لازمی ابتدائی مرحلہ یہی ہے۔ اس مرحلے کو صبر سے طے کرنا ہی پڑیگا۔"

(روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔ ص ۵۸)

مارچ ۴۴ء میں اجتماعِ دارالاسلام کے موقع پر جو تقریر کی گئی تھی اس کے حسبِ ذیل فقرے بھی قابلِ ملاحظہ ہیں:

"اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ وہ کم سے کم ضروری صفات کیا ہیں جو اس دعوت کے کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں کے مقابلے پر نکلیں، اُس باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اس کی رضا کے خلاف چلنے کے لئے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے۔ اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلانِ جنگ

کریں........حدیثِ نبویؐ کے مطابق اپنے آپ کو اس گھوڑے کی طرح بنائیے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی گھومے پھرے، بہر حال اس حد سے آگے نہیں جاسکتا جہاں تک اس کی رسّی اسے جانے دیتی ہے، ایسے گھوڑے کی حالت اس آزاد گھوڑے سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو ہر میدان میں گھومتا ہے، ہر کھیت میں گھس جاتا ہے اور جہاں ہری گھاس دیکھتا ہے وہیں پوری بے صبری کے ساتھ ٹوٹ پڑتا ہے۔ آپ آزاد گھوڑے کی سی کیفیت اپنے اندر سے نکالیں اور کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کی کیفیت اپنے اندر پیدا کریں۔"

(روداد جماعت اسلامی حصہ دوم۔ صفحہ ۱۷-۱۸)

"آپ بحیثیتِ فرد اور بحیثیتِ جماعت اپنے نصب العین کے اتنے دلدادہ اور اپنے اصول کے اتنے پابند ہوجائیں کہ آپ کے گردوپیش جو لوگ کسی نصب العین کے بغیر بے اصول زندگیاں بسر کر رہے ہیں وہ آپ کی پابند اصول زندگی کو گوارا نہ کرسکیں........(مگر بگڑی ہوئی سوسائٹی کے ساتھ آپ کی) یہ ساری کشمکش اس ذہنیت کے ساتھ ہونی چاہیئے جس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بیماروں سے کشمکش کرتا ہے۔ دراصل وہ بیمار سے نہیں بلکہ بیماری سے لڑتا ہے اور اس کی تمام جدوجہد ہمدردی کی روح سے لبریز ہوتی ہے۔" (ایضاً صفحہ ۸-۹)

"ہمیں مسلسل اور پیہم سعی اور باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کی عادت ہونی چاہیئے۔ ایک مدت دراز سے ہماری قوم اس طریقِ کار کی عادی رہی ہے کہ جو کام ہو کم سے کم وقت میں ہوجائے، جو قدم اٹھایا جائے ہنگامہ آرائی اس میں ضرور ہو، چاہے مہینہ دو مہینہ میں سب کیا کرایا غارت ہو کر رہ جائے۔ اس عادت کو ہمیں بدلنا ہے۔ اس کی جگہ بتدریج اور بے ہنگامہ کام کرنے کی مشق ہونی چاہیئے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اگر آپ کے سپرد کیا جائے تو بغیر کسی فوری اور نمایاں نتیجہ کے اور بغیر کسی داد کے آپ اپنی پوری عمر صبر کے ساتھ اسی میں کھپا دیں۔ جہاد فی سبیل اللہ میں ہر وقت میدان گرم ہی نہیں ہوا کرتا ہے اور نہ ہر شخص اگلی ہی صفوں میں لڑسکتا ہے۔ ایک وقت کی میدان آرائی کے لیے بسا اوقات پچیس پچیس سال تک لگاتار خاموش

تیاری کرنی پڑتی ہے اور اگلی صفوں میں اگر ہزاروں آدمی لڑتے ہیں تو ان کے پیچھے لاکھوں آدمی جنگی ضروریات کے اُن چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو ظاہر بین نگاہوں میں بہت حقیر ہوتے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۲۷-۲۸)

دسمبر ۱۹۵۰ء میں اجتماعِ لاہور کے موقع پر جو تقریر کی گئی تھی، اس کے بھی چند اقتباسات ہمارے مدعا پر اچھی روشنی ڈال سکتے ہیں:-

"ہمارا مطالبہ ہر مومن سے یہ ہے کہ وہ حنیف ہو، یک سو ہو، یک رنگ مومن و مسلم ہو، ہر اس چیز سے کٹ جائے (اور نہ کٹ سکتا ہو تو پیہم کٹنے کی جدوجہد کرتا رہے) جو ایمان کی ضد اور مسلمانہ طریقِ زندگی کے منافی ہو، اور اچھی طرح مقتضیاتِ ایمان میں سے ایک ایک تقاضے کو سمجھے اور اسے پورا کرنے کی پیہم سعی کرتا رہے۔" (دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات ص ۲۱)

"ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمامِ کار فساق و فجار کے ہاتھ سے نکل کر مومنین صالحین کے ہاتھ میں آئے، بلکہ ایجابی طور پر ہماری دعوت یہ ہے کہ اہلِ ایمان و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ ہو، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یک رنگ ہو، نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح اور پاکیزہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ اُن تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لئے ضروری ہیں۔ اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ دُنیا کے موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے اُن اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دے۔" (ایضاً صفحہ ۲۳-۲۴)

"ہم دراصل ایک ایسا گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد و تقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو، اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت و صلاحیت بھی عام دنیا داروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔ ہمارے نزدیک دنیا کی تمام خرابیوں کا ایک سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نیک لوگ نیکی کے صحیح مفہوم سے نا آشنا ہونے کی

(بقیہ بر صفحہ ۱۰۹)

حق اور باطل

(نعیم صدیقی)

قرآن میں حق و باطل کی آویزش کے سلسلے میں مختلف مواقع پر حسبِ ذیل آیات وارد ہوئی ہیں:-

(۱) ——— وما خلقنا السماء والارض وما بینهما لٰعبین ۝ لو اردنا ان نتخذ لهوا لاتخذنٰه من لدنا ان کنا فٰعلین ۝ بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغه فاذا هو زاهق ۝ (الانبیاء)

اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو کچھ ہے، اسے کھیل تماشے کی حیثیت سے پیدا نہیں کیا۔ اگر ہم ایسا چاہتے کہ اسے سامانِ تفریح بنائیں تو ہم یقیناً باختیارِ خود (کسی کی مزاحمت کے بغیر) اسے ایسا ہی بنا لیتے ——— بشرطیکہ ہم یہی کرنے والے ہوتے لیکن (ہم نے ایسا نہیں کیا ہے، بلکہ کائنات کو ایسے اصول و مقصد کے ساتھ بنایا ہے کہ اس اصول و مقصد کے پیشِ نظر) ہم حق کو باطل سے ٹکراتے ہیں، پھر وہ (حق) اُس کا (باطل کا) سر کچل دیتا ہے، یہاں تک کہ پھر وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔

(۲) ——— وقل جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل کان زهوقا ۝

اور کہہ دو کہ (لو) حق آپہنچا اور باطل میدان چھوڑ کر بھاگ نکلا، بلاشبہ باطل تو ہے ہی بھاگنے والا!

(۳) ——— الم تر کیف ضرب الله مثلا کلمة طیبة کشجرة طیبة اصلها ثابت وفرعها فی السماء، تؤتی اکلها کل حین باذن ربها ——— ومثل کلمة خبیثة کشجرة خبیثة اجتثت من فوق الارض ما لها

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مثال دی ہے کہ پاکیزہ اصول ایک ایسے پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ خوب اچھی طرح (زمین میں) اتری ہوئی ہو اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں، اور جو ہر وقت اپنے برگ و بار لا رہا ہو ——— اور (دوسری طرف) ناپاک اصول کی مثال اس

من قرار ط — ناپاک درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی اوپر سے پھوٹ نکلا ہو، اُس کے لئے کچھ بھی پائداری نہیں ہے۔

(۴) ——— انزل من السماء ماءً

فسالت اودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبدا رابیا و مما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ کذلک یضرب اللہ الحق والباطل فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔ (الرعد)

اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، تو ندی نالے اپنے اپنے مقدور بھر (پانی لے کر) بہ نکلے، پھر وہ سیل اپنے اوپر پھولا ہوا جھاگ اٹھا لیتا ہے۔ اور اسی طرح زیور اور دوسری ضروریات بنانے کے لئے آگ میں جو کچھ (دھاتیں) پگھلاتے ہیں اس پر بھی جھاگ آجاتا ہے ——— ٹھیک اسی طرح اللہ حق اور باطل (کی حقیقت) کو بیان کرتا ہے ——— تو پھر جہاں تک جھاگ کا تعلق ہے وہ تو سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے، اور جو کچھ کہ نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہے وہ زمین میں باقی رہتا ہے۔

ان آیات کا منشا بالکل واضح ہے۔ ان میں ایک حقیقت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ دنیا کا نظام ایسے اصولوں پر بنایا گیا ہے کہ اس میں حق اور باطل دونوں قوتیں بالکل الگ الگ اور متمیز ہو کر باہم ٹکراتی ہیں، دوسری حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ فتح اور پائداری اور استقلال و استقرار تمام تر حق، راستی، نیکی اور خیر کے لئے ہے، بخلاف اس کے، باطل، جھوٹ، بدی اور شر کے لئے شکست، ناپائداری، عدمِ استقلال اور عدمِ استقرار مقدر ہے دوسرے لفظوں میں کوئی مستقل قدر اگر ہے تو حق میں ہے، باطل کی ساری قدر نمائشی ہے۔

یہ آیات جس ماحول میں نازل ہوئی تھیں اس میں حق اور باطل یا اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان عملاً ایک سخت درجے کی کشمکش ہو رہی تھی اور عین اس کے درمیان حامیانِ حق کو یہ اطمینان دلایا جا رہا تھا کہ پورا نظامِ کائنات حق ہی کے لئے سازگار ہے باطل کی عارضی نشوونما اگر ہوتی بھی ہے تو فطرتِ عالم کے تقاضے بہرحال اس کے خلاف ہوتے ہیں، پس تم حامیانِ باطل کے کرّوفر سے مرعوب ہوئے بغیر جدوجہد جاری رکھو، آخر کار یہ بازی

تمہارے ہاتھ رہے گی۔ چنانچہ ان آیات سے اسلامیانِ عرب نے وہ جذبۂ یقین صحیح طریق سے اخذ کیا جس کے کارفرما ہوجانے کے بعد وہ اس واقعہ سے ہراساں ہوئے کہ مشرکینِ عرب ہی نہیں، گرد و پیش کی تمام اقوامِ باطل کی بنیادوں پر زندگی استوار کئے ہوئے ہیں اور مٹھی بھر لوگ حق کے علمبردار بن کر نکل رہے ہیں، اور نہ وہ اس صورتِ حال سے پریشان ہوئے کہ وہ نظامِ حق جو کئی صدیوں سے معرضِ تعطل میں ہے آخر وہ آج کیسے غالب آسکتا ہے۔ چنانچہ ان کی جدوجہد کے نتائج نے ان پر عملاً ثابت کردیا کہ قرآن نے حق و باطل کی کشمکش کا جو فلسفہ پیش کیا تھا وہ ایک اٹل فلسفہ تھا۔

وہ فلسفہ آج بھی اٹل ہے، اور آج بھی ہم اس سے جذبۂ صادق اخذ کرنے کے ضرورت مند ہیں، کیونکہ ہم بھی حق و باطل کی کشمکش کے طوفان میں کھڑے ہیں۔

لیکن ان آیات کے صحیح مفہوم کو نہ پاسکنے کی وجہ سے بعض اصحاب کو سخت غلط فہمی ہوتی ہے۔ چنانچہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب لوگ اسلام اور اس کے اصولوں کو بروئے استدلال پوری طرح حق ماننے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں دیکھتے، تو پھر وہ اپنے فوق العقلی عدم اطمینان کو اس دلیل سے ظاہر کرتے ہیں کہ اگر نیکی درحقیقت کوئی مستقل قدر رکھتی ہے اور فطرتِ انسانی سے اسے خصوصی مناسبت ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ نیکی کم ہے اور بدی کا زور ہے، سچائی پر کاربند ہونے والوں کی تعداد قلیل ہے اور جھوٹ کو اختیار کرنے والوں کی بھاری اکثریت ہے؟ ——— اور پھر یہ کہ اگر اسلام نظامِ حق تھا تو آخر وہ چلا کے روز؟ کُل تیس ہی سال؟ پھر آئندہ کے لئے اس سے کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں؟

یہ سوال مسلمان کہلانے والے بعض خاص اقسام کے مخالفینِ نظامِ اسلامی کی طرف سے بار بار اٹھایا جاتا ہے۔ چنانچہ شروع میں جب پاکستان میں نظامِ اسلامی کا مطالبہ ابھرا تو یہ سوال زور و شور سے سامنے آیا لیکن پھر دب گیا۔ اب پھر جب اسلامی دستور کی تحریک عروج پر آرہی ہے اور انقلابِ قیادت کا مرحلہ سامنے ہے یہ سوال پھر اٹھایا گیا ہے۔ گزشتہ ہفتے عشرہ میں متعدد اصحاب کی زبان سے یہ سوال سننے میں آیا۔ ہمارے اس سے پہلے بھی اس کا جواب دیا گیا تھا اور اب پھر اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس وال کو دراصل مذکورۂ بالا آیات کے منشاء کے ٹھیک ٹھیک خلاف استعمال کیا جارہا ہے۔ مذکورہ آیات کا

مقصدِ نزول یہ تھا کہ مسلمان جس حق پر عقل و وجدان کے لحاظ سے ایمان لا چکے تھے اس کے لئے کشمکش کرتے وقت یہ یقین رکھیں کہ کامیابی ہے ہی حق کے لئے، اور اس یقین کی وجہ سے ان کا عزم اور ولولہ تازہ رہے۔

لیکن پیشِ نظر سوال کو اس لئے استعمال کیا جا رہا ہے کہ آج جو لوگ عقل و وجدان کے لحاظ سے اسلام پر ایمان لا کر اس کے قیام کی جدوجہد میں مصروف ہیں کم از کم اُن کے عزم کو متزلزل کر دیا جائے، اور غیر شعوری طور پر وہ اسلام کے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا ہو جائیں کہ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ایسی موجود ہے کہ یہ اول تو اپنے غلبے کے لئے سخت ترین جدوجہد چاہتا ہے اور پھر اگر اسے غلبہ ملے بھی تو اس میں زوال و اختلال بہت جلد نمودار ہو جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ سوال جس سطحی طریق سے اٹھایا جاتا ہے، اسی سطحی سماعت کے ساتھ اُسے سنایا جاتا ہے، پھر نہایت سطحی نگاہ سے اس سوال کی روشنی میں انسانی تاریخ و تمدن کو دیکھا جاتا ہے، اور علیٰ ہذا القیاس بالکل سطحی تفکر کے ساتھ اس سے کوئی نتیجہ برآمد کر لیا جاتا ہے۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ اس سوال کے جواب میں ان تمام ضروری امور کو نمایاں کر دیں جن پر اچھی طرح نظر نہ رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سوال کو دو حصوں میں تقسیم کریں:

ایک یہ کہ کیا حق ناکام ہے اور باطل کامیاب؟

دوسرے یہ کہ نظامِ حق صرف تیس سال ہی کیوں چلا؟

پہلا سوال

پہلے سوال کے جواب میں جو بات اول قدم پر جان لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ حق کی ناکامی اور باطل کی کامیابی اصولاً کوئی معنیٰ ہی نہیں رکھتی۔ کامیابی اور ناکامی کا تعلق خود انسان سے ہے۔ اگر بالفرض سارے انسان مل کر حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو پھر بھی حق ناکام نہیں ہوتا، ناکام وہ انسان ہی ہوتے ہیں جنھوں نے حق کو قبول کرنے سے گریز کیا اور اس کے فوائد سے بہرہ اندوز نہ ہو سکے۔ سچائی ایک اصول ہے اور اگر وہ اصول حق ہے تو خواہ اسے ساری دنیا قبول کر لے، یا کوئی ایک متنفس بھی اختیار نہ کرے وہ بہر حال ایک اصول

ہی رہے گا، جیسے صفائی اور طہارت ایک ایسا فطری اصول ہے جو بجائے خود حق ہے، اسے کوئی مانے تو بھی یہ حق ہے اور کوئی ایک متنفس بھی اس پر عمل پیرا نہ ہو تو بھی یہ حق ہی رہے گا۔ کامیاب ہم ان انسانوں کو سمجھیں گے جو اس اصولِ حق کو اپنائیں۔ پھر روشنی کی مثال لی جا سکتی ہے کہ ایک شخص روشنی کو پسند نہیں کرتا اور وہ آنکھیں بند کر کے چلتا ہے تو اس کے نتیجے میں ٹھوکریں وہی خود کھائے گا اور ناکام بھی وہی ہوگا، روشنی کی ناکامی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ روشنی کو نہ کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے، نہ پاؤں چلنا ہے، نہ ٹھوکریں کھانے کا کوئی خطرہ درپیش ہے، اور نہ کامیابی و ناکامی کے درمیان وہ معلق ہے۔ اُسے کوئی پوری طرح گُل بھی کر دے تو بھی ناکام وہ خود ہوگا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر آگے چلیے۔

حق کی گرانی اور باطل کی ارزانی

یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ جسے اندھیرا پسند ہو اسے کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑتا، لیکن جو کوئی روشنی چاہے اُسے دیئے اور تیل بتی اور چراغ دان کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ آپ اپنی صحت بگاڑنا چاہیں تو یہ کام ہر لحاظ سے آسان ہے، لیکن بگڑی ہوئی صحت کو بنانا ہو یا اچھی صحت کو بحال رکھنا ہو تو تازہ ہوا، ورزش، غسل اور صفائی، غذا کی درستی، سونے جاگنے اور کام کے اوقات کی باقاعدگی، اور جذبات و اخلاق کی نگہداشت کے لیے خاص طور پر فکر کرنی ہوگی۔ زیادہ آسانی سے یہ بات یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر ایک پہاڑ کی اونچی چوٹی سے نیچے لڑھکنا ہو تو اس "مقصدِ جلیلہ" کے لیے سوائے اس کے اور کچھ نہ کرنا پڑے گا کہ آپ ایک دفعہ لڑھکنے کے لیے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیں، بخلاف اس کے اگر آپ نیچے سے اُس چوٹی تک پہنچنا چاہیں تو آپ کو کششِ زمین کے خلاف زور لگانا پڑے گا، قدم تھکیں گے، دم پھولے گا، اعصاب پر بار پڑے گا، دورانِ خون تیز ہوگا، قلب زور سے دھڑکے گا، پسینہ آئے گا اور جب کہیں جا کر آپ چوٹی پر پہنچیں گے۔ یہی معاملہ نیکی اور بدی اور حق اور باطل کے بارے میں پیش آتا ہے۔ آپ کو سیرتِ بد مطلوب ہو تو کسی بڑی محنت کی ضرورت نہ ہوگی، لیکن سیرت نیک کی تعمیر میں بڑی مشقت کرنی ہوگی اور پھر اس کی حفاظت کا انتظام کرنا ہوگا۔ آپ بدنامی کی متاع خریدنا چاہیں تو کوئی بڑی قیمت صرف نہیں ہوتی، لیکن نیک نامی اور عزت و آبرو کی جنس پر عمر بھر کی کمائی کھپانی پڑتی ہے۔ آپ اپنی کھیتی میں اگر جھاڑ جھنکاڑ اگانا چاہیں تو نہ ہل چلانا ضروری، نہ سہاگہ پھیرنا ضروری، نہ پانی اور کھاد دینا

ضروری، نہ باڑ لگانا اور نلائی کرنا ضروری، بلکہ یہ "قیمتی فصل" خود بخود نشو و نما پاتی رہے گی، اس کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ کھیتی کو اس کے حال پر چھوڑ دیں لیکن اگر آپ کوئی باغ اور چمن اگانا چاہیں، یا غلے اور دوسری قیمتی اجناس کی فصل اٹھانا چاہیں تو اس کے لئے زمین جوتیں گے، بوئیں گے، پانی اور کھاد دیں گے، نلائی کریں گے باڑ لگائیں گے، جب کہیں جاکر مدعا حاصل ہوگا۔ حق کے لئے مشقت ضروری ہے اور باطل بغیر مشقت کے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ خیر پر بہت بڑی قیمت صرف ہوتی ہے اور شر کوڑیوں کے مول، بلکہ مفت لٹایا جا رہا ہے اخلاقی صفائی اور طہارت کے لئے بڑا انتظام ضروری ہے، لیکن اخلاقی غلاظت کے لئے صرف تغافل و تساہل کا اہتمام کافی ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ایک شخص اچھی فصل لینے کے لئے محنت کرنے سے کتراتا ہے اور زمین کو بنجر چھوڑ دیتا ہے تو ناکامی اس کی ہوئی یا اچھی فصل کی؟ ایک شخص حفظانِ صحت کی فکر نہیں کرتا اور بیمار پڑتا ہے تو ناکامی صحت کے اصول کی ہوئی یا بیمار پڑنے والے کی؟ ایک شخص حق اور راستی کی دولت اور نیکی اور خوش خلقی کی متاعِ بیش بہا کو خریدنے کے لئے محنت کی قیمت صرف کرنے پر تیار نہیں ہوتا تو ناکامی حق اور نیکی کی نہ ہوگی، خود خریدار کی ہوگی۔

کثرت و قلت کا معیار

یہ بات کہ حق قیمتی ہے اور باطل ارزاں ہے یا نیکی کے لئے محنت کی ضرورت ہوتی ہے اور بدی کے لئے تن آسانی سے زیادہ کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، اس سے قطع نظر کرکے لوگ جب اس امرِ واقعہ کو دیکھتے ہیں کہ اہلِ حق کم ہیں اور بندگانِ باطل کی کثرت پائی جاتی ہے اور نیکی پر کاربند ہونے والوں کا تناسب بدی میں مبتلا ہونے والوں سے زیادہ نہیں ہے تو وہ سوچتے ہیں کہ یہ حق کیسا حق ہوا اور یہ نیکی کیسی نیکی ہوئی جسے قبول کرنے والے ہمیشہ اقلیت میں رہتے ہیں اور اکثریت باطل کے خدمت گزاروں اور بدی کے مسلک کے علمبرداروں کی رہتی ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ نظامِ فطرت تمام تر اس طرز پر مبنی ہے کہ اس میں جو چیز قیمتی ہے وہی کم بھی ہوتی ہے اور اس سے حصہ پانے والے خوش نصیب لوگ بھی ہمیشہ کم ہوتے ہیں، لیکن دوسری طرف جو چیز جتنی گھٹیا ہے وہ اتنی ہی زیادہ بھی ہوتی ہے اور اس سے دامن بھرنے والوں کی ہمیشہ اکثریت ہوا کرتی ہے۔ لیکن کیا

گھٹیا چیز کی کثرت اسے قیمتی بنا سکتی ہے اور قیمتی چیز کی قلت وگرانی اسے گھٹیا بنا سکتی ہے؟ یقیناً نہیں!

خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا میں اونٹ کٹارا، جھٹ کٹیا اور جھاڑ جس کثرت سے اگتے ہیں اس کے مقابلے میں یاسمین وگلاب اور لالہ ونرگس ہمیشہ کم ہوتے ہیں۔ یہاں بھوسے کے انبار کے انبار پائے جاتے ہیں لیکن سُنبل وریحان کا جمال کمیاب ہے۔ یہاں سنگ ریزوں کی بے پناہ اکثریت ہے لیکن ہیرے اور جواہر انتہائی اقلیت رکھتے ہیں۔ یہاں تانبے، پیتل اور ٹین کی بڑی بڑی مقداریں ہر روز کانوں سے برآمد ہو رہی ہیں، لیکن سونا بہت تھوڑی مقدار میں نکلتا ہے۔ یہاں سمندر کی ہر موج سینکڑوں خزف ریزے اچھالتی رہتی ہے، لیکن وہ صدف جس سے موتی برآمد ہو، شاذ ونادر ہی ہاتھ آتا ہے۔ یہاں جب دودھ کو بلویا جاتا ہے تو چھاچھ کی بہت بڑی مقدار حاصل ہوتی ہے لیکن مکھن جو اس سے نکلتا ہے مقدار کے لحاظ سے چھاچھ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہاں جنگلوں میں ہزارہا ہرن چھلانگتے پھرتے ہیں لیکن مشکِ ختن جن کے نافوں سے حاصل ہوتی ہے وہ قلیل التعداد ہیں۔ یہاں یاوہ گوئی کے نمونے دن رات سڑکوں اور بازاروں اور مجلسوں میں سامنے آتے رہتے ہیں، لیکن ادب وشعر کے حسین وجمیل نمونوں کا تناسب بہت ہی کم رہتا ہے۔ یہاں بیماریوں جیسی نامطلوب شئے عام ہے لیکن معیاری صحت جیسی جنسِ مطلوب کم ہی لوگوں کو حاصل ہے لیکن آخر اس سے نتیجہ یہ کیسے نکل آئے گا کہ یاسمین وگلاب، سنبل وریحان، سونے، موتی، جواہرات، مکھن، آہوئے ختن، ادب وشعر اور صحت کے لئے ناکامی ہے کیونکہ وہ مقدار وتعداد کے لحاظ سے کم ہیں، اور دوسری طرف اونٹ کٹارے، جھڑ کٹیے، بھوسے، تانبے، پیتل، ٹین، خزف، چھاچھ، آہوئے بے نافہ، یاوہ گوئی اور بیماریوں کے لئے کامیابی ہے، کیونکہ وہ تعداد ومقدار کے لحاظ سے پیش پیش ہیں؟

یہ نہ بھولئے کہ قیمتی چیز کی کم مقدار گھٹیا چیز کی زیادہ مقدار کو خرید سکتی ہے۔ جب دونوں متقابلاً ایک ہی منڈی میں سامنے رکھی جائیں تو حق اور خیر کی اقلیت باطل اور شر کی اکثریت سے زیادہ قیمت پائے گی۔ یعنی مدعا ہے اس آیت کا کہ:

لَا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ، وَلَوْ اَعْجَبَکَ کَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ!	ردی چیز اور پاکیزہ چیز برابر نہیں ہو سکتیں، چاہے تمہیں ردی چیز کی کثرت مرعوب ہی کیوں نہ کرتی ہو!

فطرت نے ہر گھٹیا چیز کو اس لئے عام کیا ہے کہ اس کی قیمت گرا دے اور اسے ذلت کے مقام پر رکھے اور اس نے ہر اعلیٰ چیز کو اس لئے کم رکھا ہے کہ اس کی قدر بڑھے، وہ گراں بہا ہو اور وہ تمام اہل عزم کی نگاہوں میں عزت حاصل کرے۔

کیا آپ چاہتے ہیں کہ فطرت اس ترتیب کو الٹ دیتی اور اس کی مارکیٹ میں سونا ارزاں ہوتا اور لوہا اور ٹین گراں بہا ہوتا؟ وہ یاسمین و گلاب کو ہر طرف اگاتی پھرتی اور جھاڑ جھنکار اگانے کے لئے محنت و مشقت کا مطالبہ کرتی؟ ـــــــــــــــــــ

ادب و شعر کی صلاحیت اس کے ہاں سے ہر کس وناکس کو ارزانی ہوتی اور یاوہ گوئی کا آرٹ پیدا کرنے کے لئے اعلیٰ درجے کے مخصوص دماغ کم تعداد میں فراہم کئے جاتے؟ صحت و تندرستی کے لئے کسی اہتمام کی ضرورت نہ ہوتی، بلکہ محنت و اہتمام کی ضرورت بیمار ہونے کے لئے پڑتی؟ تعمیر مفت میں ہوتی اور تخریب کے لئے انسانی کو قوتیں صرف کرنی پڑتیں؟ آدمی روشنی بہم پہنچانے کے لئے کسی ساز وسامان کا منت کش نہ ہوتا بلکہ الٹا اسے چراغوں اور بجلی کے قمقموں کی جگہ ایسے آلات کی احتیاج ہوتی جو اندھیرا پھیلا سکیں؟ بلندی کی طرف لپکنے کے لئے کوئی جسمانی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی، بلکہ پستی کی طرف لڑھکنے کے لئے زور لگانا پڑتا؟ نیک بننے کے لئے کسی طرح کے تکلف کی حاجت نہ ہوتی بلکہ اشرار بننے کے لئے لٹریچر، تعلیم، تبلیغ، جماعت بندی اور نظام ہائے حکومت کے قیام سے مدد لینی پڑتی؟ حق پر چلنے کے لئے انسان کسی تکلیف اٹھانے کا ذمہ دار نہ ہوتا اور نہ انبیاء و کتب کا سلسلہ جاری کرنا پڑتا، بلکہ یہ سب کچھ ہوتا تو فروغِ باطل کے لئے ہوتا؟

دوسرے لفظوں میں یہ کہیے کہ آدمی کو جنت تو ملتی مفت میں، البتہ جو شخص دوزخ میں جانے کا خواہشمند ہوتا، اس کو خاص طور پر اس مقصد کے لئے ریاضتیں کرنی پڑتیں!

ذرا موجودہ نظام فطرت کی ترتیب کو الٹ کر غور تو فرمائیے کہ کس طرح کا نقشہ مترتب ہوتا ہے!

اس نظام فطرت کے اندر عالم انسانی میں بھی اعلیٰ خدمات انجام دینے کی صلاحیتیں رکھنے والے کم ہوتے ہیں اور معمولی قسم کے افراد زیادہ ہوتے ہیں۔ اہلِ حکمت، موجدین، معلمین، مصنفین، ہنرور، مقرر، ادیب، شعرا، لیڈر، اور اس طرح کے افراد کی تعداد کبھی بھی عامیوں [illegible] سے زائد تو کجا برابر بھی نہیں ہوا کرتی۔ ان

مناصب پر آنے کے لئے جہاں غیر معمولی فطری صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں، وہاں اکتسابی لحاظ سے بھی محنتیں اور ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن حامی بننے کے لئے کچھ بھی نہیں کرنا پڑتا۔ ٹھیک یہی صورت حق کے اصولوں پر چلنے، نیکی کو شاملِ راہ بنانے اور اعلیٰ سیرت تعمیر کرنے والوں کی بھی ہے کہ انھیں کچھ تو فطری طور پر سلامتیٔ طبع کی ضرورت ہوتی اور پھر اکتسابی طور پر بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہی بات تھی جسے علامہ اقبال نے یوں بیان کیا کہ :—

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پس حق پر چلنے والوں اور نیکی پر کاربند ہونے والوں کی کمی یہ معنیٰ نہیں رکھتی کہ حق اور نیکی ناکام قوت ہے، اور نہ باطل اور بدی کی راہ پر چلنے والوں کی کثرت اس کی دلیل ہے کہ باطل اور بدی کامیاب قوت ہے! صحیح طریقِ استدلال یہ ہے کہ کامیاب وہ لوگ ہیں جو حق کی رفعتوں کی طرف بڑھنے کے لئے ضروری محنت کر سکیں اور ناکام وہ لوگ ہیں جو حق کی منزلِ بلندی کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ کر سکے اور باطل کے گڑھوں میں سہولت پسندی کی وجہ سے پڑے رہ گئے۔ زیادہ لوگ اگر گڑھے میں پڑے رہیں تو گڑھا پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں سے بلند نہیں قرار دیا جا سکتا اور کم لوگ اگر چوٹی پر پہنچے ہوں تو چوٹی گڑھے سے پست نہ ہو جائے گی۔

برائی بھلائی کے روپ میں

فرض کیجیے کہ "لپٹن چائے" بہت ہی کامیاب اور مقبول ہو جائے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک دوسری فرم جو لپٹن کے درجے کی چائے فراہم نہیں کر سکتی، بلکہ وہ اپنی چائے کو گھٹیا پاتی ہے، اگر میدان میں آنا چاہے تو وہ کونسی چال چلے گی؟ —— وہ یہ کرے گی کہ اپنے ہاں کی چائے کا نام لپٹن سے ملتا جلتا رکھے گی، ٹریڈ مارک اس کے مشابہ بنائے گی، لیبل بھی اسی کے انداز کا بنائے گی، اور کوشش کرے گی کہ بہت سے لوگ محض فریبِ نظر کی وجہ سے اس کا مال خریدیں اب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ ان طریقوں کو اختیار کر کے یہ نئی فرم خود اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ واقعی لپٹن کی چائے بہت ہی اعلیٰ درجے کی چائے ہے اور پھر وہ اپنا کاروبار جتنا بھی پھیلائے گی، درحقیقت اتنا ہی زیادہ وہ خود لپٹن چائے کے لئے میدان ہموار کرے گی! اسی طرح جو صراف پیتل کی انگوٹھی پر سونے کا ملمع کر کے بازار میں پیش کرتا ہے وہ خود سونے کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتا ہے۔

بالکل ایسے ہی اگر آپ انسانی تاریخ تمدن اور تاریخِ اخلاق کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ باطل اور برائی جب کبھی بھی میدان میں لائے گئے ہیں حق اور نیکی کے روپ میں لائے گئے ہیں۔ گناہ کو ہمیشہ کامیاب ہونے کے لئے صواب کا جامہ آراستہ کرنا پڑا ہے اور شر کو فروغ حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ خیر کی نقل اتارنی پڑی ہے۔ باطل اور بدی کے اس طریقِ کار کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا ہر باطل اور بدی اور نظام فاسد اور ان کے علمبرداروں نے اس بات کا خود اعتراف کر کے اپنی مساعی شروع کی ہیں کہ قدر و قیمت اگر ہے تو حق اور خیر کے لئے ہے اور کامیابی اگر حاصل ہو سکتی ہے تو راستی اور نیکی اور نظام فلاح ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ نے ہر جھوٹے کو دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرتا ہے، لیکن کسی سچے کو بھی آپ نے دیکھا کہ وہ اپنے آپ کو جھوٹا ثابت کرے؟ آپ نے ہر دعوتِ شر دینے والے کو خیر کی علمبرداری کا اعلان کرتے ہوئے پایا ہوگا، لیکن کبھی آپ نے ایسا بھی منظر دیکھا کہ کوئی دعوتِ خیر دینے والا شر کی علمبرداری کا اعلان کر رہا ہو؟ آپ نے ہر خادم باطل کو اپنے برسرِ حق ہونے کے دلائل دیتے ہوئے ملاحظہ فرمایا ہوگا لیکن کبھی کسی صاحب حق کو بھی یہ استدلال کرتے دیکھا ہے کہ میں خادم باطل ہوں؟ آپ نے غیر اسلامی نظاموں کے قیام کی جدوجہد کرنے والوں کو بارہا دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو عین حامل اسلام حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن کیا کبھی آپ نے اسلامی نظام کے کسی داعی کو بھی غیر اسلامی نظام کے خادم کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرتے دیکھا ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ پیتل پر لوگ سونے کا ملمع کر کے لاتے ہیں لیکن سونے پر کسی صراف نے پیتل کا ملمع کبھی نہیں کیا؟ کیا وجہ ہے کہ گھٹیا مال بیچنے والے لوگ اعلیٰ مال بنانے والوں کی نقل کرتے ہیں لیکن اعلیٰ مال بنانے والے نقلی مال بیچنے والوں کی نقل نہیں کرتے؟

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دراصل فطرت کے نظام میں اور انسانی تاریخ کے بازار میں، اصل کامیابی حق اور نیکی ہی کے لئے مقدر ہے، یہی وجہ ہے کہ باطل اور برائی کے سوداگر جب بھی اپنا مال لاتے ہیں تو اس کو حق اور نیکی کے رنگ میں رنگ کر لاتے ہیں۔ وہ جھوٹ کو لاتے ہیں لیکن سچائی کے لیبل کے ساتھ، وہ ذلت کو لاتے ہیں لیکن عزت کے سائن بورڈ کے ساتھ، وہ شر کو لاتے ہیں لیکن خیر کے ٹریڈ مارک کے ساتھ، وہ مفاد پرستی کو

لاتے ہیں لیکن خدمت کا عنوان دے کر، وہ مضرت کو لاتے ہیں لیکن افادیت کا رنگ روغن چڑھا کر!

نیکی اپنے نام کے ساتھ آتی ہے، بدی کے نام کے ساتھ نہیں آتی، لیکن دوسری طرف بدی کبھی اپنے نام کے ساتھ نہیں آتی، نیکی کے نام کے ساتھ آتی ہے۔ خیر ٹھیک ٹھیک اپنے روپ میں آتا ہے، شر کے روپ میں نہیں آتا، لیکن شر اپنے روپ میں نہیں آتا بلکہ خیر کے روپ میں آتا ہے۔ حق پوری طرح بے نقاب ہو کر نمودار ہوتا ہے، اپنے چہرے پر باطل کی نقاب نہیں ڈالتا، لیکن باطل میں بے نقاب ہو کر آنے کی جرأت نہیں نہیں، وہ مجبور ہے کہ حق کی نقاب اوڑھ کر آئے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق اور نیکی ہی کے لئے اصل کامیابی ہے۔ وہ خود تو کجا ان کا نام بھی اتنا کامیاب ہے کہ باطل اور بدی بھی اسی نام کا سہارا لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس نام کا سہارا لئے بغیر وہ یکسر ناکام ہیں۔ باطل اور بدی کا حق اور نیکی کے نام یا روپ کو استعمال کرنا خود اس بات کی شہادت ہے کہ بازارِ حیات میں سارا فروغ حق اور نیکی کے لئے ہے۔

رہی یہ بات کہ حق کے روپ میں جو باطل لایا گیا ہو اس سے کتنے گاہک دھوکا کھا گئے یا نیکی کے بھیس سے جو بدی پیش کی گئی تھی اس سے کتنے خریداروں کی نظر بندی ہوگئی، اس سے حق کی قدر و قیمت اور نیکی کی کامیابی اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر کسی بازارِ صرافہ میں ہزاروں گاہک بھی روزانہ ملمع کی انگوٹھیاں سونے کے بھاؤ خرید لے جائیں تو اس سے سونے کی کامیابی ناکامی سے اور پیتل کی کم قدری قیمت کی گرانی سے نہیں بدل جاتی۔ کامیابی اور ناکامی تو ساری خریداروں کی ہوگی کہ وہ کھرے اور کھوٹے کی تمیز کرنے میں چابک دستی دکھاتے ہیں یا کوتاہی!

حق اٹل ہے، باطل متغیر ہے

حق ـــــ اس کے جو جو بھی اصول ہیں، وہ از آدم تا ایں دم ایک ہی رہے ہیں۔ لیکن باطل ان اصولوں کے جواب میں کوئی ایسے اصول نہیں لے کے آتا جو شروع سے اب تک ایک ہی رہے ہوں۔ باطل ہر دور میں نئے اصول لے کر اٹھتا ہے، نیا فلسفہ بناتا ہے، نیا استدلال گھڑتا ہے، نیا روپ دھارتا ہے، نئی قدریں لے کے آتا ہے اور پھر حق سے مقابلہ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ شکست کھاتا ہے اور میدان چھوڑ دیتا ہے۔ پھر جا کر از سرِ نو کچھ اور اصول تلاش کرتا ہے

کچھ اور فلسفہ گھڑتا ہے، کچھ اور استدلال بناتا ہے اور پھر نئے لاؤ لشکر کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ پھر شکست کھاتا ہے تو کسی نئے رنگ میں ابھرتا ہے۔ اس کا کوئی اصول پائدار نہیں، کوئی رنگ پختہ نہیں، کوئی فلسفہ اٹل نہیں، کوئی استدلال ایسا نہیں جو پائے چوبیں نہ رکھتا ہو۔

بخلاف اس کے حق ہر دور میں ایک ہی اصول رکھتا ہے، ایک ہی فلسفہ سامنے لاتا ہے، ایک ہی استدلال پیش کرتا ہے، ایک ہی اس کا روپ ہوتا ہے، اور باطل کے ہر حملے کے جواب میں وہ اپنے ایک ہی ناقابل فسخ ہتھیاروں سے جنگ آزما ہوتا ہے۔ حق کی فرم کے مقابلے میں ہزاروں فرمیں قائم ہوتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں پھر بنتی ہیں، پھر ٹوٹتی ہیں، لیکن وہ فرم بدستور اپنی جگہ جمی رہتی ہے۔

حق نے کہا خدا ایک ہے، لیکن باطل نے اس کے جواب میں کبھی دو خداؤں کا فلسفہ پیش کیا، کبھی تین خداؤں کا، کبھی بے شمار دیوتاؤں کا، کبھی ہمہ اوست کا، کبھی الحاد و دہریت کا، کبھی "اندھی قوت" کی خدائی کا، اور وہ برابر نت نئے فلسفے گھڑتا جا رہا ہے، لیکن حق آج بھی یہی کہتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی خدا ہے۔ حق نے کہا کہ سچائی، دیانت، پاسِ عہد، حفظِ عصمت، احترامِ ملکیت، ہمدردی و اخوت، انسانی جان کا احترام انسانی اخلاق کے بنیادی اصول ہیں۔ باطل نے اس کے جواب میں قسم قسم کے اخلاقی نظریئے گھڑے، لیکن حق آج بھی اپنے اصولوں کی طرف بدستور دعوت دیتا ہے اور وہی اصول آج بھی فطرتِ انسانی سے مطابقت رکھتے ہیں۔

باطل کی ناکامی کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ آج تک وہ کوئی اٹل اصول انسانیت کے سامنے نہ رکھ سکا۔ وہ کوئی دعوئ فطرتِ انسانی سے مستقل طور پر منوا نہ سکا۔ آج ایک چیز پیش کی اور کل خود ہی اس کی تردید کر دی، آج ایک نظریہ بنایا اور کل خود ہی اسے توڑ کے پھینک دیا، آج ایک تحریک کھڑی کی اور کل وہ نسیاً منسیا ہوگئی، آج ایک نظام بنایا اور کل اسے خود ہی ناکارہ قرار دے کر فراموشی کے گڑھے میں پھینک دیا۔ باطل تو ایک ایسا مبتدی آرٹسٹ ہے جو اپنے بنائے ہوئے ہر نقشِ فن پر پھر خود ہی تھوکتا ہے، لیکن حق کے آرٹسٹ نے جو نمونۂ فن ایک مرتبہ پیش کر دیا وہ پھر ہمیشہ کے لئے انسانی تاریخ کے عجائب گھر کی زینت بن گیا۔

کامیابی آخر وہ ہے یا یہ!

رہا یہ سوال کہ حق کے مستقل اور سادہ آرٹ کو رشک کم ملے اور باطل کے سہل اور غیر مطمئن آرٹ کو آشنا بہت

مل گئے تو اس سے نہ کسی فن لطیف کی قدروقیمت گھٹتی ہے اور نہ کسی احمقانہ فن کی قدروقیمت بڑھتی ہے۔ دوامی قدریں رکھنے والے آرٹ کے تھوڑے سے آرٹسٹ مٹا مٹا کے بنانے اور بنا بنا کے مٹانے والے آرٹسٹوں کے بڑے سے بڑے لشکر پر بھی بھاری رہیں گے۔

حق قائم بالذات ہے
باطل "طفیلی" ہے

آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کسی کاشتکار نے پیازی یا گوکھروؤں کی فصل بوئی ہو اور کوئی کھیت اسی فصل کو حاصل کرنے کے لئے جوتا اور سیراب کیا جائے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ آپ کارآمد فصلیں بوتے ہیں اور ان کی اوٹ میں زمین کی زرخیزی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ غیر مطلوب قسم کی بوٹیاں اور گھاس پھونس بھی اُگ آتی ہے۔ محنتی کسان ان کا استیصال کرنے کے لئے گوڑی اور نلائی کرتا رہتا ہے، پھر بھی کچھ نہ کچھ طفیلی پودے مطلوبہ فصل کے حصے کی غذا اُڑا کر پل جاتے ہیں۔ پھر آپ نے کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ تنہا آکاس بیل کہیں اُگی ہوئی پائی جائے، اس کی نہ جڑ ہوتی ہے، نہ زمین براہِ راست اسے کوئی غذا دینے پر تیار ہوتی ہے، بلکہ ہمیشہ آپ دیکھیں گے کہ آکاس بیل کسی دوسرے درخت یا جھاڑی کے طفیل پرورش پاتی ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ حق اور باطل کا ہے۔ باطل جہاں بھی پایا جاتا ہے کسی حق کے سہارے پایا جاتا ہے۔ خالص باطل دُنیا میں کہیں بھی وجود نہیں رکھتا، انسانی فطرت کی کھیتی میں وہ اگر اُگتا ہے تو حق کی اوٹ میں اُگتا ہے، اور اس کے حصے کی غذا کے بل پر پلتا ہے یہ آکاس بیل کی طرح دوسرے درختوں اور پودوں کے اوپر پھیلتا اور پھولتا ہے۔

دُنیا میں ہر برائی کسی نیکی کا سہارا لے کر جیتی ہے اور ہر گناہ کو کسی صواب کی اوٹ لینی پڑتی ہے۔ آج تک جتنے نظام ہائے باطل پیش کئے گئے ہیں اور دنیا میں قائم ہو سکے ہیں، ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو خالص باطل اور خالص برائیوں پر مشتمل ہو، بلکہ باطل اور برائی جب بھی چلی ہے تو اس حق اور نیکی کے بل پر چلی ہے جس کا کچھ نہ کچھ جزو ہر نظام باطل میں شامل رہتا ہے۔

تمام نظام ہائے باطل خالص باطل ہونے کے بجائے حق و باطل کے مرکبات ہوتے ہیں اور ان کی مقبولیت، ان کا قیام، ان کا استحکام اور ان کا پھیلاؤ حق کی اس مقدار کے اوپر منحصر ہوتا ہے

جس کی وجہ سے وہ جی جاتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری میں بھی باطل موجود ہے اور نظامِ اشتراکی میں بھی باطل کا ایک بڑا جز شامل ہے، لیکن حق کی ایک مقدار اس کے ساتھ بھی ہے اور ایک اس کے ساتھ بھی ہے، اور یہی حق کی مقدار ہے جس کے سہارے دونوں کے باطل جی رہے ہیں۔ اُس کے پاس بھی بعض بھلائیاں ہیں جن میں انسانیت کے لئے اپیل موجود ہے، اور اس کے پاس بھی کچھ خوبیاں ہیں جن میں فطرتِ آدم کے لئے کشش ہے۔ یہ دونوں جب بھی بلاتے ہیں تو اپنے بھلائی کے پہلو سامنے لاکر بلاتے ہیں اور لوگ اگر انھیں قبول کرتے ہیں تو ان کی بھلائیوں ہی کے لئے قبول کرتے ہیں ـــــ ان کی برائیاں تو ان بھلائیوں کے اوپر آکاس بیل کی طرح لپٹی ہوئی ہیں کہ ان کو قبول کیجئے تو از خود ساتھ آئیں گی۔

جب کوئی نظامِ باطل حق کی کم سے کم مطلوبہ مقدار کو بھی کھو بیٹھتا ہے تو پھر اس کا پنپنا محال ہو جاتا ہے اور خالص باطل کے لئے تو دنیا میں کوئی چانس ہی نہیں!

تاریخ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی نظامِ باطل کے قیام و بقا کا انحصار بھی اس کے جزوِ حق پر ہوتا ہے اور اس وجہ سے اُس کی کامیابی دراصل حق کی کامیابی ہی کا نتیجہ ہے۔ ماضی ہو یا حال، ہر اصول اور فلسفہ اور نظام اپنے جزوِ حق کی وجہ سے مقبول اور قیام پذیر ہوتا ہے۔

حق و باطل کے مرکبات کا تصادم

تاریخ اصولوں، فلسفوں اور نظاموں کے تصادم کی جولانگاہ ہے۔ اس تصادم میں کامیابی اور ناکامی جس اصول پر ہوتی ہے وہ خود گواہی دیتا ہے کہ کامیاب حق ہے اور باطل بہرحال ناکام ہے۔

یہ تو واضح ہے ہی کہ خالص باطل کے لئے دنیائے انسانیت میں کوئی جگہ نہیں۔ حق و باطل کے مرکبات پائے جاتے ہیں۔ ان مرکبات میں تصادم ہوتا ہے اور ہر تصادم میں بازی اُس اصول، فلسفے اور نظام کے ہاتھ رہتی ہے جس میں باطل کا تناسب کم اور حق کا تناسب زیادہ ہو۔ ۵ فی صدی حق اور ۱۰ فی صدی حق رکھنے والے اصول و نظام کے درمیان اگر ٹکر ہو گی تو ۱۰ فی صدی حق رکھنے والا نظام میدان مار لے گا۔ وہ ساری توڑ پھوڑ جو قرآن کی ذیل کی آیت کی رو سے ہوتی، اسی اصول پر ہوتی ہے:-

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعضٍ — اگر اللہ تعالیٰ ان (اہلِ باطل) میں سے بعض کو بعض کے

لفسدت الارض۔ ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی۔

پھر قانونِ تصادم کے تحت قرآن کا فلسفہ یہ بتاتا ہے کہ مرکباتِ حق و باطل میں سے کوئی بھی جب خالص حق کے سامنے آتا ہے تو اس کے لئے آخر کار لازماً شکست مقدر ہوتی ہے۔ جن آیات کو اس مضمون کے آغاز میں درج کیا گیا ہے ان میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ جب بھی کوئی گروہ خالص حق کو لے کر اٹھتا ہے اور اس کے لئے کما حقہٗ جدوجہد کرتا ہے تو آخر کار کامیابی اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ العاقبۃ للمتقین! انجام کار اہلِ تقویٰ کے لئے ہے!

خالص حق کے علمبرداروں کی کمی کیوں؟

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ جب حق انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے جب نظامِ کائنات پوری طرح سازگار اسی کے لئے ہے، جب حقیقی اور پائیدار کامیابی بھی اسی کے لئے مقدر ہے تو کیا وجہ ہے کہ اس کے علمبردار اقلیت میں رہتے ہیں؟ اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ تاہم ایک مرتبہ پھر ہم اس جواب کو تازہ کر دینا چاہتے ہیں۔

صفائی انسانی فطرت کے مطابق بھی ہے اور صفائی میں پوری پوری افادیت بھی ہے، لیکن پھر بھی صفائی کے تقاضے پورا کرنے والوں کی تعداد کم ہے۔ اور صفائی کی نمائش کی اوٹ میں ہر طرح کی غلاظتوں کو چھپا چھپا کر رکھنے والوں کی اکثریت ہے! صحت ہر شخص کو محبوب ہے اور بیماری کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا، لیکن وہ لوگ جو حفظانِ صحت کے اصولوں پر پوری طرح کاربند ہوں اور بیماری سے بچنے کی تدابیر اختیار کریں بلحاظ تناسب اقلیت میں رہتے ہیں۔ جو صورت معاملہ یہاں ہے وہی حق کے اختیار کرنے میں بھی ہے۔

انسان میں ایک طرف بھلائی اور فائدے کی خواہش موجود ہے اور دوسری طرف اس میں سہولت پسندی اور آرام طلبی کا رجحان بھی کارفرما ہے۔ بھلائی اور فائدے پر محنت صرف ہوتی ہے اور محنت صرف کرنے میں آرام طلبی کا رجحان مانع ہوتا ہے۔ ان دونوں رجحانات کی کشمکش کے تحت آدمی کو عجیب قسم کے ذہنی احوال پیش آتے ہیں۔ وہ کبھی قریب کے چھوٹے فائدے کو دور کے بڑے فوائد پر ترجیح دیتا ہے، وہ کسی فوری مشقت سے بچنے کے لئے بعد کی تکلیف کو گوارا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ تھوڑی محنت کر کے تھوڑا سا فائدہ حاصل کرنے کو اس سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے کہ زیادہ محنت کر کے زیادہ بڑا فائدہ حاصل کرے۔

اب چونکہ حق یا باطل کو قبول کرنے پر انسان کو فطری جبریت میں مبتلا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اسے اختیار دیا گیا ہے،

کہ وہ آزادی سے خود انتخاب کرے۔ اس وجہ سے خالص حق کی گراں بہا دولت کو حاصل کرنے کے لئے محنت و ایثار کی بھاری قیمت ادا کرنے والے مردانِ جری کم ہوتے ہیں اور حق و باطل کے سستے مرکبات کے لئے محنت و ایثار کی تھوڑی پونجی صرف کرنے والے زیادہ نکلتے ہیں۔ جیسے سستے مال کے گاہک ہمیشہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اگر انسانوں کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ حق و باطل میں سے خود کسی ایک کو انتخاب کریں اور ساری زندگی اس کی خدمت میں صرف کردیں تو ظاہر بات ہے کہ اس آزادی کے تحت یہ واقعہ ہونا کچھ بھی بعید نہیں کہ ایک بڑی اکثریت خالص حق سے اعراض کرے، پھر وہ کسی غلط اصول اور باطل نظام کی علمبردار بنے، وہ اس کے لئے دعوت پھیلائے، وہ اس کے لئے منظم ہو، وہ اس کے لئے ذرائع و وسائل جمع کرے، وہ اس کے لئے لڑائیاں لڑے، وہ اس کے لئے لٹریچر اور نظام تعلیم فراہم کرے، وہ اس کے سامنے ساری دُنیا کی گردن جھکانے میں مصروف ہو جائے ——— یہاں تک کہ اس کا غلبہ عالمگیر ہو اور وہ تاریخ کے ایک طویل دور پر چھا جائے۔

ایسا ہی ایک دور ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں، اور اس میں باطل کا غلبہ دیکھ کر بظاہر اتنی مرعوبیت طاری ہوتی ہے کہ غلبۂ حق کے امکان سے مایوسی ہوتی ہے حالانکہ یہ دوسرا امکان بھی اسی طرح موجود ہے! باطل کے غلبے کے لئے اس کے حامیوں کی بہت بڑی اکثریت جتنا کام کرتی ہے، وہی کام حق کے حامیوں کی نسبتہً بہت کم تعداد سرانجام دے سکتی ہے اور اہلِ حق کا ایک مختصر گروہ اگر معیاری درجے کا ہو تو وہ ساری انسانیت کو اپنے آگے بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرح ہانک سکتا ہے۔ یہ وہ فرق ہے جو اُدھر کی کثرت اور اِدھر کی قلت کا توازن (BALANCE) برابر کردیتا ہے۔

(باقی آئندہ)

انفرادی ملکیت اسلام میں

(۳)

نعیم صدیقی

اسلام میں املاک کے لئے کوئی مقداری تحدید نہیں!

سوشلزم کے تحت ملکیت کے جو نظریات تشکیل پذیر ہوتے ہیں، ان میں سے اشتمالیت ہی سوشلزم کے اصولوں کا منطقی تقاضا معلوم ہوتی ہے جس نے پیدائش دولت کا پورا نظام ہی نہیں، بلکہ صرفِ دولت کے تمام انفرادی اختیارات سے بھی فرد کو محروم کرنا ضروری سمجھا ہے لیکن سوشلزم کے اس منطقی تقاضے کو عملاً لے کے چلنا ممکن نہ تھا اس لئے افراد کے داعیۂ ملکیت کی تسکین کے لئے انفرادی ملکیت کے حقوق کو مختلف طریقوں سے محدود کر دینے پر اکتفا کیا گیا۔

بعد میں سوشلزم کے اصول اور انفرادی ملکیت کے جذبے کے درمیان ہونے والی کشمکش نے ان کے سمجھوتے (COMPROMISE) کے لئے مختلف ڈھیلی شکلیں پیدا کیں۔ انھی شکلوں میں سے نمایاں یہ تھیں کہ افراد کو بھی املاک کا حق تو دیا جائے لیکن املاک پر مقداری اور استعمالی تحدیدات لگا دی جائیں، نیز سرمایہ، زمین یا دوسرے ذرائع پیداوار بھی افراد کے پاس رہنے دیئے جائیں مگر ان کی ایک خاص حد سے زائد مقدار کو متعین کر دیا جائے کہ انفرادی حقِ ملکیت اس سے زائد وسعت نہیں اختیار کر سکتا۔

علاوہ بریں سوشلزم کے داعی جب کسی انفرادی ملکیت پر چلنے والے نظامِ زندگی کو اجتماعی ملکیت کے نظام میں بدلنا چاہتے ہیں اور اس قسم کی ہمہ گیر تبدیلی کے لئے وہ یک دم جست لگانے میں رکاوٹیں محسوس کرتے ہیں تو پھر ایک تدریجی طریقِ کار اختیار کرتے ہیں۔ وہ پہلا قدم یہ اٹھاتے ہیں کہ مثلاً زمین کی ایک خاص مقدار سے زائد کی ملکیت افراد کے لئے بذریعہ قانون ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس طرح افراد کی املاک میں ریاست کی جابرانہ مداخلت کا دروازہ جب ایک مرتبہ کھول لیا جاتا ہے تو پھر اس دروازے سے اجتماعی ملکیت کا اصول ایک خونی آمریت کے ہاتھ

میں ہاتھ ڈالنے کا دخل ہوتا ہے اور فرد کے حقوق کا قتلِ عام شروع ہو جاتا ہے۔

محدود املاک کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص حد سے (جو بھی طے کی گئی ہو) زائد املاک ——— سرمایہ، زمین، آلات یا نجی زر وغیرہ ——— سوسائٹی میں معاشی و تمدنی مفاسد پھیلانے کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ جب اس حد سے ان کے بڑھنے کو روک دیا جاتا ہے تو مفاسد کی روک تھام ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ کہتا ہے کہ فی نفسہٖ املاک کی ایک خاص مقدار ہے جو انسان کو اخلاقی پست اور معاشرتی لحاظ سے سوسائٹی کے لئے مضر بنا دیتی ہے۔ اس مقدار کے ساتھ انسان آلۂ شر بن جاتا ہے اور یہ مقدار نہ ہو تو پھر وہ آدمی خیر ہو جاتا ہے۔ گویا مفاسد انسان کے اندر سے نہیں ابھرتے کہ ان کی اصلاح کی جائے، بلکہ اس کے باہر سے ——— املاک کی مقدار کے بڑھنے کی وجہ سے ——— اس پر چھا جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریے کو انسان کے خیالات، اس کے جذبات اور اس کے اخلاق کی تربیت سے کوئی مطلب نہیں، بلکہ وہ املاک کی مقداروں کو، بجائے خود انسانوں کے، قطع و برید کرنے کو انسانی فلاح کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا ایک اسلامی معاشرہ میں جس میں ایک اخلاقی حیثیت اسلام کے اخلاق و تربیت اور نظامِ قانون کے ساتھ کارفرما ہو، املاک کی کوئی مقدار فی نفسہٖ کسی فرد کے اخلاق کے لئے موجبِ فساد ہو سکتی ہے؟

آپ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں؟ وہ بے شمار لوگوں کی محنت کو روپے، زمین اور آلات کے زور سے ناجائز کمائی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

مگر جس اسلامی ریاست کی طرف سے معاشی نظام کے اصولیات میں یہ طے کیا گیا ہو کہ کسی کی محنت سے استفادہ کرنے والے کے لئے واجب ہوگا کہ وہ اس کی بنیادی ضروریات کو پورا کرے (ورنہ ریاست خود ضامن ہے کہ ہر شہری کی ضروریات کا انتظام کرے اور اس مقصد کے لئے وہ بہرحال زائد املاک رکھنے والوں پر ہی بار ڈالے گی) اس کے زیر سایہ یہ کیسے ممکن ہے کہ محنت کش سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکے؟

پھر سے اپنے کاروبار میں سے ڈھائی فی صدی زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، حکومت کے دوسرے ٹیکس بھی دیتے ہیں اور دوسرے چندے اور صدقات بھی دیتے ہیں جو اکثر مفادِ عامہ پر صرف ہوں گے۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ محنت کے جائز معاوضے دے کر اور جملہ حقوق ادا کر کے بھی ... یا وہ بچ سکتا ہے کہ مزید سرمایہ، مزید زمین، مزید ذرائع پیداوار جمع کرتا

یہ ٹھیک ــــــ وہ یقیناً زیادہ ذرائع جمع کر کے زیادہ کمائی کرنے لگتا ہے اور بہت سا روپیہ جمع کر لیتا ہے، لیکن اس روپے سے وہ کرے گا کیا؟

آپ کہتے ہیں کہ وہ اس کو عیاشی میں جھونک دے گا اور عوام ضروریات سے محروم ہو جائیں گے۔

لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ اسلام میں نہ شراب جائز، نہ موسیقی جائز، نہ رقص جائز، نہ قمار کی تفریح جائز، نہ ریشمی لباس جائز، نہ سونے چاندی کے برتنوں کا رکھنا جائز، نہ تصاویر اور مجسموں کا وجود جائز، نہ تقاریب پر بینڈ باجے اور دوسری فضول رسوم جائز ــــــ عیاشی کے بڑے بڑے شادرے تو یہاں بند ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے فالتو روپے کو کرائے پر چڑھا کر دولت کا بہاؤ روک کر اس سے اپنے حوض بھرتا رہے گا۔

لیکن آپ کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اسلامی معاشرہ میں سود اور سود کے اصول پر بنک کاری اور سٹہ کے اصول پر تجارت وغیرہ کے سارے طریقے ممنوع ہیں۔

پھر آپ یہ خدشہ ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ دولت کو بے کار ڈالے رکھے گا۔

حالانکہ جمع شدہ روپے پر زکوٰۃ عائد کر کے اسلام نے جمع کرنے والے کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اسے پیدا آور مقاصد میں لگائے، لہٰذا وہ بے کار نہیں ڈال سکتا، نیز اس کے باوجود بھی اگر وہ کچھ جمع کر کے رکھے تو اس کی موت پر اس کے سرمائے اور ذرائع پیداوار کے ساتھ اس کا بے کار ڈالا ہوا روپیہ بھی متعدد مستحقین میں بٹ جائے گا۔

اندریں حالات املاک کی مقداری تحدید کا نظریہ ایک مسلمان کی نگاہ میں بالکل فضول اور بے سر و پا قرار پاتا ہے۔

اب آئیے اور معاملہ رکھیئے اسلامی قانون کے سامنے!

فرض کیجیئے کہ ایک شخص سو ایکڑ زمین کا مالک ہے، آپ کہتے ہیں کہ ہم اس کو صرف ۵۰ ایکڑ زمین رکھنے کا حق دینا چاہتے ہیں، بقیہ پچاس کو اس سے منسلب کر لینا چاہیئے۔ اسلامی قانون آپ سے پوچھتا ہے کہ ۵۰ ایکڑ کی ملکیت کو جائز اور ۱۰۰ کی ملکیت کو ناجائز قرار دینے کے لئے آپ کے پاس قانونی دلائل کیا ہیں؟ آپ کو ثابت کرنا ہے کہ اس نے پچاس ایکڑ ناجائز کمائے ہیں یا کسی دوسرے سے زبردستی چھینے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ شخص چونکہ ۱۰۰ ایکڑ کا مالک ہے اس لئے سر بسر غلط ہے اور جب تک ۵۰ ایکڑ سے زائد رقبہ اس کے پاس رہے یہ سوسائٹی اور دوسرے افراد کی حق ماری کا مجرم رہے گا۔ قانون پوچھتا ہے کہ وہ حق بتایئے جو اس نے کسی سے سلب کیا ہے یا وہ زیادتی بیان کیجئے جو

اس کی طرف سے سوسائٹی پر ہو رہی ہے تاکہ اس کی تلافی کی جائے۔ قصور اگر کوئی ہے تو اس شخص کا ہے یا ۵۰ ایکڑ زمین کا؟ اگر قصور ۵۰ ایکڑ زمین کا ہو تو اس کا حل سوچا جائے اور اگر قصور اس شخص کا ہو تو اس کی اصلاح کی جائے۔

اب آپ بگڑ کر کہتے ہیں کہ یہ قانون تو دراصل ملاؤں کی بنائی ہوئی پرانی فقہ ہے جو آج کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔

بہت اچھا! آپ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو سامنے رکھ کر کوئی دلیل اس پر لائیے کہ روپے پیسے، سونے چاندی، مویشیوں، زمین، مکانات، لباس اور دوسرے ضروریات و آلات میں سے کسی ایک کے بارے میں اشارۃً بھی کہیں مقداری تحدید کے لئے کوئی قانونی نکتہ ملتا ہے ـــــ کوئی نظیر، کوئی مثال، کوئی قانونی فیصلہ، کوئی اجتہادی اجماع!

اگر آپ کو ایسی کوئی دلیل نہ ملے تو پھر آپ کو حق کیا ہے کہ آپ تحدیدِ املاک کے نظریے کو اسلام سے کوئی نسبت دیں۔ ـــــ ایک فکر جو پیدا ہی سوشلزم کے گھر ہوئی، اس کا شجرۂ نسب اسلام سے ملانے کے لئے سوائے دین کی مضحکہ انگیز تاویل کرنے کے اور کوئی راستہ آپ کو نہ مل سکے گا۔

اسلام میں ساری تحدیدات کمانے کے ذریعوں، خرچ کرنے کے راستوں اور دوسروں سے معاملہ کرنے کے طور طریقوں کی غلط نوعیتوں پر ہیں، نہ کہ کمانے اور خرچ کرنے اور املاک رکھنے کی مقداروں پر۔ اگر فساد مقداروں کا ہوتا تو پھر ساری تحدیدیں مقداروں پر ہونی چاہیئے تھیں اور اصولوں اور طور طریقوں کو آزاد ہونا چاہیئے تھا، لیکن چونکہ اسلام کے نزدیک جڑ فساد غلط اصول اور غلط طریقے ہوتے ہیں، لہٰذا اس نے ساری تحدیدیں اسی پہلو سے عائد کی ہیں اور مقداروں کے لئے کوئی ضابطہ بندی نہیں کی، سرمائے، وسائل اور ذرائع آمدنی کا کوئی راشننگ سسٹم اس نے جاری نہیں کیا۔

نمونے کی سوسائٹی جو نبی صلعم نے صحابہؓ کی تربیت سے خود بنائی تھی وہ املاک کی مقداری تحدید سے پاک تھی۔ کسی چیز پر بھی تحدید نہ تھی کہ اتنے سے زائد درہم و دینار رکھنا حرام، اتنے سے زیادہ بھیڑ بکریاں اور اونٹ پالنا ممنوع اور اتنے سے زائد زمین پر قبضہ ناجائز ـــــ جو زائد ہو وہ ریاست کی ملکیت!

قرآن میں اللہ نے رزق اور دوسری نعمتوں کے بارے میں آخری بات جو کہی ہے کہ یؤتیہ من یشاء بغیر حساب تو اس کے کیا معنی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی بخشائش کے لئے

ضابطہ نہیں رکھا کہ تمام افرادِ انسانی کے لئے پیمانہ ایک ہوگا، نہ کسی کو اُس سے کم ملے گا، نہ زائد۔

کہا جاتا ہے کہ بلاشبہ "تحدیدِ ملاک" کا نظریہ عالمِ انسانی کی تازہ ایجاد ہے، لیکن یہ اُن حالات کا نتیجہ ہے جو قرآن کے نزول کے بہت بعد پیدا ہوئے ہیں۔ مگر سوچئے تو سہی کہ یہ حالات بہرحال غیر اسلامی نظام کی ایک بدترین صورت ـــــ سرمایہ داری ـــــ کے تحت ہی تو پیدا ہوئے ہیں، خود اسلامی نظام کے اندر تو اس طرح کے مفاسد کا امکان نہیں کہ باہر سے ان کے لئے سامانِ علاج خرید کے لانا پڑے۔ یہ مفاسد غیر اسلامی نظام کے ہیں اور وہ ان کے لئے غیر اسلامی علاج ایجاد کرتا رہے ہمیں اس سے کیا دلچسپی! ہمارا کام تو موجودہ نظام کو اسلامی نظام سے بدلنا ہے۔

کیا اسلام کاروباری سرمائے کی ملکیت پر کوئی پابندی لگاتا ہے؟

اشتراکی اسٹیٹ نے کاروباری سرمائے اور ذرائعِ پیداوار کی ملکیت کو افراد کے لئے حرام ٹھیرا دیا ہے۔ آپ اپنا روپیہ عیاشی میں صرف کرسکتے ہیں لیکن اس کو کاروبار میں لگانے یا اس کے ذریعے ذرائعِ پیداوار حاصل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

شریعتِ اسلامیہ کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ خدا کے حلال ٹھیرائے ہوئے کو حرام قرار دینا اپنے آپ کو خدا کی ہمسری کے مقام پر لانا ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی زمین میں بھیجتے ہوئے مجاز ٹھیرایا کہ وہ جائیں اور رزق حاصل کریں اور رزق کے ذرائع بھی۔ متاع کی تعریف میں یہ بھی داخل ہے وہ بھی! لیکن اس سرزمین پر کچھ ایسے فلسفی پیدا ہو جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ رزق تو حاصل کرسکتے ہو لیکن ذرائعِ رزق پر حکمران طاقت کا قبضہ ہوگا اور جو کچھ تم کو ملے گا براہِ راست خدا کے خزائن سے نہیں بلکہ اس حکمران طاقت کے واسطے سے ملے گا۔ تم پہلے کما کے سب کچھ اس طاقت کے حوالے کرو، پھر یہ طاقت جس طرح مناسب سمجھے گی تم میں بٹوارہ کرے گی۔

اس فلسفے کو ماننے والے جائز ہی نہیں، لازم قرار دیتے ہیں کہ فرد کو ذرائعِ پیداوار کی ملکیت سے محروم کر دیا جائے ـــــ آیئے یہ سوال خود اسلام کے سامنے لے جا کے رکھا جائے۔ ہم خدا کی کتاب اور اس کے رسول سے پوچھتے ہیں کہ ایک شخص اس کا مجاز ہے یا نہیں کہ وہ اپنے روپے سے تجارت کرے، ایک خراس لگا کر غلے کی پسائی کا کام کرے، تانگہ خریدے اور کرائے پر چلائے، ٹائپ رائٹر مشین مہیا کرے اور معاوضہ لے کر لوگوں کی عرضیاں

ٹائپ کرے، زمین مول لے اور اجرت دے کر کاشت کرائے، باغ لگائے اور مالیوں کو ملازم رکھ کر پھل پیدا کرے، مکان تعمیر کرے اور کرائے پر دے، یا بیل گاڑیاں چلائے اور لوگوں کے بوجھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچائے؟

اب فرمائیے کہ خدا کی کتاب، اس کے رسول کی سنت (قول اور عمل دونوں) اور ان کا اتباع کرنے والے خلفائے راشدین کا نظام حکومت اس سوال کا جواب کیا دیتے ہیں؟ بغیر اس کے کہ بیچ میں آپ اپنی کوئی "اگر مگر" شامل کریں، آپ وہاں سے کیا جواب پاتے ہیں؟

جب بات یہاں پہنچتی ہے تو لوگ "یہ زمانہ" اور "آج کل کے حالات" کا ذکر چھیڑ کر کہیں سے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات ایسے موقع پر پیش کی جاتی ہے وہ "الارض للّٰہ" کے قرآنی الفاظ سے زبردستی نکالی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن ہی نے تو زمین کو بندوں کی ملک کے بجائے اللہ کی ملک قرار دیا ہے، اور اسی لئے قرار دیا ہے کہ یہ مرکزی ذریعۂ پیدائش دولت ہے۔

ناواقف آدمی اس استدلال کو سن کر چونک جاتا ہے، لیکن اگر کوئی قرآن پڑھنے والا یہ مطالبہ کر بیٹھے کہ اچھا ذرا قرآن کھول کر دیکھیں تو سہی کہ یہ الارض للّٰہ کس کلام کا ایک جزء ہے تو اس دلیل بازی کی ساری عمارت ڈھے جاتی ہے۔ یہ کلمہ اپنے موقع پر قطعاً دوسرے مطالب کے ساتھ وارد ہے۔ قرآن کا بیان یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے جب ان کی قوم فرعون کے مظالم کا ذکر کر کے مایوسی اور بددلی کا اظہار کرتی ہے تو وہ اس کو جدوجہد جاری رکھنے کی ترغیب دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

استعینوا باللّٰہ واصبروا ان الارض للّٰہ یورثھا من یشآء من عبادہ ط والعاقبۃ للمتقین ٥	اللہ سے مدد طلب کرو، اور ثابت قدم رہو۔ زمین کا مالک (فرعون نہیں) اللہ تعالیٰ ہے۔ اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دے، اور اس معاملے میں انجام کار کامیابی اہل تقویٰ کے لئے ہے۔

اپنے صاف صاف مفہوم کی رو سے یہ آیت خالص "سیاسی" ہے اور ایک فی صدی بھی "معاشی" نوعیت نہیں رکھتی۔ اگر یہ آیت معاشی مسائل کے تحت آتی تو قدرتی طور پر الارض کے معنی "کھیتی" یا زیر کاشت زمین کے ہوتے۔ غور کیجئے اس مقام پر "الارض للّٰہ" سے متجددین کرام جو استدلال کرتے ہیں اگر اللہ میاں کو اسی کے مطابق بات کہنی تھی کہ

کسی کھیت پر مالکانہ زمین کا حقِ ملکیت تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ جو کاشت کرے صرف وہ کاشت کے زمانے تک اس کا مالک ہے تو پھر گویا ان حضرات کے نزدیک وہ ایسی ہستی ہے جسے (نعوذ باللہ) ایک سیدھی سی بات کہنا بھی نہیں آتا اور اس کے لئے اسے مناسب الفاظ نہیں ملتے۔

پھر یہ حضرات مفسرین آیت کو اپنی جگہ چھوڑ کر دوڑتے ہیں اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب اٹھا لاتے ہیں کہ دیکھو اس میں "الارض للہ" کی شرح میں یہ لکھا ہے کہ زمین ایک کاروان سرائے کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو آئے اس میں بسیرا لے اور رخصت ہو جائے، یہاں مالک بننے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اسی کتاب میں "الارض للہ" کی یہ تعبیر کے پیش کرنے والے امام نے جہاں واضح طور پر ملکیت کے انسانی حق کے بارے میں قلم اٹھایا ہے اور جہاں دوسرے کی محنت خریدنے کا اصول واضح کیا ہے اور جہاں زمین کو دوسروں سے کاشت کرانے کو قاعدہ بیان کیا ہے وہاں ان کی نگاہ نہیں جاتی اور نہ یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں وجہ تطبیق کیا ہے۔

اگر "الارض للہ" کا مفہوم یہی تھا کہ ذرائع پیداوار ملت کے دستِ تصرف میں رہیں گے اور افراد کو سارا رزق خدا کے خزانوں سے براہ راست نہیں، بلکہ ریاست کے "قومی ملکیت" کے نظام کی معرفت ملے گا تو پھر قرآن کے مصنف (خدا تعالیٰ) اور اس کے شارح (نبی صلعم) کے بارے میں آپ کی رائے اس کے سوا کیا قرار پائے گی کہ (نعوذ باللہ) نہ حکم دینے والے کو اپنی بات واضح کرنا آیا اور نہ شرح کرنے والے کی عقل میں اصل بات بیٹھی، اور نہ ان دونوں کو مان کر نظامِ زندگی قائم کرنے والوں کو ایک حکم کی تعمیل کا سلیقہ آیا۔

سوال یہ ہے کہ انفرادی ملک کے ایک معروف طریق کو بدلنے کے لئے ویسا ہی انقلابی اعلان اور انقلابی عملی اقدام ضروری قرار پاتا ہے جیسا شراب اور سود اور بیٹیوں کے قتل اور کعبہ کے ننگے طوافوں اور بت پرستی کے خاتمے کے لئے کیا گیا تھا، پھر کیوں اس طرح کا تبدیلی پیدا کرنے والا اعلان و اقدام نہ کیا گیا؟ پھر اس میں رکاوٹ کیا تھی کہ اس وقت کی ساری زمین اور سرمایہ اور ذرائع پیداوار صاف صاف طریق سے افراد سے لے کر اجتماعی نظم کے حوالے کر کے "جوائنٹ سسٹم" پر زندگی استوار کر دی جاتی۔ پورے عرب کو ایک یا متعدد کمیون (COMMUNE) کی صورت میں بدلنا وقت کے حالات کے لحاظ سے نہ مشکل تھا نہ غیر مفید۔ یہ کام کرنا اگر اسلام کو مطلوب ہوتا تو اس کا بہترین

موقع اس وقت پیدا ہوا تھا جب مدینے میں مہاجرین کی ایک بڑی تعداد وارد ہوئی تھی لیکن اس وقت بھی نبی صلعم نے کوئی قانونی حکم جاری کئے بغیر محض اخلاقی اپیل کرتے ہوئے انصار سے صرف یہ چاہا کہ وہ اپنے انفرادی املاک کو برقرار رکھتے ہوئے مہاجرین کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد کریں اور انصار نے اس اپیل پر اس حد تک عمل کر کے دکھایا جس حد تک انسان فراخدلی اور ایثار میں آگے جا سکتا ہے۔ لیکن بہرحال یہ نہیں ہوا کہ نبی صلعم نے صدرِ ریاست ہونے کی حیثیت سے سرمایہ و وسائل پر سے کچھ انفرادی ملکیت کو ساقط کرتے ہوئے قانوناً حکومت کو دولت کا مالک بنا کر افراد کے لئے مشترک کمائی اور مشترک صرف کی صورت قائم کر دی ہو۔ آپ پوری دولت پر حکومت کے قانونی تصرف کو بھی چھوڑ دیجئے، اس کا کوئی ثبوت نکال کے دکھا دیجئے کہ مہاجرین کا وقتی مسئلہ حل کرنے کے لئے بھی کسی ایک فرد کی کسی نوعیت کی کسی ایک ملک کے خلاف بھی قانونی کارروائی کی گئی ہو۔ اس کو تم اپنے پاس رکھنے کے مجاز نہیں ہو۔ تمہاری زمین، یا مکان، یا اونٹ اور مویشی بحقِ سرکار اجتماعی ملک میں داخل کرنے کے لئے ضبط کئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین جنہوں نے اسلامی اخوت کے اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے سے اپنے اموال کو ہمیشہ بچا کے رکھا، ان سے بھی نہ مہاجرین کے مسئلے کا مقابلہ کرتے ہوئے اور نہ قریشِ مکہ کی جنگی تیاریوں کی ٹکر سہتے ہوئے قانونی جبر سے کوئی ملک سلب نہیں کی گئی۔ بخلاف اس کے خلیفۂ اول نے زکوٰۃ روکنے والوں کے خلاف سرکاری طور پر سخت ترین اقدام کر کے واضح کر دیا کہ اللہ کے مطالبے کو رد کرنے کا مجاز کوئی نہیں۔ پھر اگر انفرادی ملک کا خاتمہ ہی خدا کے دین کو مطلوب تھا تو اس معاملے میں کوئی کھلا کھلا اقدام کیوں نہ کیا گیا؟

مدینے کے معیاری اسٹیٹ کے تحت بڑے سرمائے کے تاجر بھی موجود رہے، بڑے زمیندار بھی موجود رہے، اونٹوں کی بڑی تعداد کو کرایوں پر چلانے والے بھی موجود رہے، پھلوں کا وسیع کاروبار کرنے والے بھی موجود رہے ــــــ لیکن کسی نے ان کے ذرائع و وسائل اور سرمایوں کے خلاف قانونی کارروائی سے کبھی کام نہ لیا۔

پھر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب "الحکم للہ" میں حکومت کو اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے اور جائز حکومت صرف وہ قرار پاتی ہے جو اس کی نیابت میں پوری ملت کے اشتراک سے چلے اور اس کو کسی فرد کی ملک قرار نہیں دیا جا سکتا

تو کیوں نہ "الارض للہ" کے ٹکڑے کا مطلب بھی یہی لیا جائے کہ چونکہ زمین اللہ کی ملک ہے لہٰذا وہ بھی "حکم" کی طرح افراد کی ملک میں دینا ناجائز ہے اور اس پر ملت کی اجتماعی ملکیت قائم ہونی لازم ہے۔

حالانکہ یہ کہنے والوں کو دونوں کا فرق نظر نہیں آتا کہ سرمایہ، زمین، آلات و وسائل وغیرہ کمائی کے ذرائع ہیں لیکن حکومت کسی کاروبار یا کرانے کے ذریعے کا نام نہیں بلکہ ایک مشترکہ نظم و نسق کا نام ہے۔ رزق اور کمائی کے ذرائع پر فرد کے لئے شریعت نے ملک و قبضے کا حق تسلیم کیا ہے لیکن حکومت کے لئے نہیں۔ اپنے اپنے ذرائع و وسائل سے افراد الگ الگ کام لے سکتے ہیں، لیکن ہر فرد اپنی اپنی جگہ حکومت نہیں چلا سکتا، ذرائع رزق ہر فرد کو الگ الگ درکار ہیں اور حسبِ صلاحیت و ضرورت درکار ہیں، لیکن حکومت بہت سے افراد کو مشترک طور پر ایک ہی قائم کرنی ہوتی ہے اور وہ ہوتی ہی ہے زندگی کے اجتماعی تقاضوں کے لئے۔

پھر معاملہ یوں نہیں ہے کہ آپ "ان الحکم الا للہ" کے ایک کلمے کو سامنے رکھ کر اس میں سے حکومت کے بارے میں سارے ضابطے اور نظریئے نکالتے چلے جائیں۔ اسی طرح "الارض للہ" کے کلمے کو سامنے رکھ کر اس پر ایک معاشی فلسفے کا محل کھڑا کرنا درست نہیں ہے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ خدا کی حکومت کے لئے جس طرح آپ کو خدا ہی کی طرف سے کچھ اصول، دستوریات، ضوابط اور عملی نظائر ملتے ہیں، اسی طرح آپ زمین اور دوسرے املاک کے بارے میں خدا سے یہ معلوم کریں کہ وہ کیا اصول، قانون اور ضوابط دیتا ہے، اور ان کی رو سے وسائل کی انفرادی ملکیت حرام ہے یا حلال! اگر حلال ہے تو اسے حرام کرنے کے لئے اتھارٹی کونسی ہے؟ خدا تعالیٰ نے اگر اپنے آپ کو زمین کا مالک قرار دینے کے بعد حکومت کے واسطے کے بغیر افراد کو حقِ ملکیت دیا ہو تو آپ کون ہوتے ہیں جو بیچ میں آ کودیں اور کہیں کہ یہ "حق" تو اسلامی نہیں ہے اور اسے سلب کر لینا چاہیئے۔ خدا کا دعوائے ملکیت تو ہے ہی اس لئے کہ وہ چاہتا ہے کہ میں اپنی ملک پر جیسے تصرف دینا چاہوں اس میں کوئی دوسرا مانع نہ ہو۔ آپ گویا اسی کی نفی کرتے ہیں۔

یہ وہ ایچ پیچ کے طریقے ہیں جن سے سوشلزم کے جدید نظریئے کو اسلام کا جامہ پہنا کر درحقیقت یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جس حقیقت کو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت دنیا پر صاف صاف واضح نہ کر سکی تھی، اُن سے بے نیاز ہو کر سوچنے والا ملحد مارکس زیادہ اچھی طرح واضح کر گیا، ملکیتِ اجتماعی کے جس نظام کو نبی صلعم

کی حکومت ٹھیک ٹھیک طریق سے نافذ نہ کر سکی اسے قائم کرنے کا حق ادا کیا تو ہیگل اور مارکس نے! جو کام دین نہ کر سکا وہ کفر نے کر دکھایا اور اب اس دین کی تکمیل بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس کفر سے مانگ تانگ کے کچھ اصول لائے جائیں اور اس میں فٹ کئے جائیں۔

اسلام اس سے بری ہے کہ اس نے ذرائع و وسائل اور کاروباری سرمائے کو کسی صورت میں بھی افراد کے لئے شجرِ ممنوعہ قرار دیا ہو۔ اس کی پالیسی تو الٹا یہ رہی ہے کہ اس نے کاروبار سے اپنی حکومت کو الگ رکھا ہے اور افراد کی آزادیٔ کسب اور آزادیٔ انتفاع کو پوری طرح برقرار رکھا ہے۔

اس دین کے لانے والے نے تو دوسرے کے سرمائے پر خود محنت کی ہے اور شراکتِ منافع پر کاروبار کیا ہے۔ حضرت خدیجہ سرمایۂ وافر کی مالک تھیں اور آپؐ ان کے سرمائے سے کاروبار کر کے پوری کمائی ان کے سامنے لا رکھتے تھے، لیکن آپؐ نے اپنی زوجۂ محترمہ تک کو خدا کی طرف سے یہ حکم نہ سنایا کہ سرمائے کی ملکیت حرام کر دی گئی ہے لیکن کچھ لوگوں پر نئی وحی اتری ہے جس کے تحت وہ نبی صلعم کی تعلیم کی اصلاح فرمانے لگے ہیں۔

کاروباری سرمائے (کاروباری زر، آلات، ذرائع و وسائل) پر شریعت کی پابندیاں صرف حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) جائز طریق سے اس کی ملکیت حاصل کی گئی ہو۔

(۲) اسے صرف کمائی کے جائز طریقوں میں استعمال کیا جائے۔

(۳) اس پر اگر دوسروں کی محنت لی جائے تو فراخدلی سے ان کے واجب لادا حقوق ادا کئے جائیں۔

(۴) اس میں سے (اور اس کی آمدنی میں سے) صدقاتِ واجبہ اور نظامِ اسلامی کے مالی مطالبات دیانتداری سے ادا کئے جائیں۔

شریعتِ اسلامی کی طرف سے ان پابندیوں سے زائد کوئی پابندیاں کاروباری سرمائے اور ذرائع و وسائل پر ثابت نہیں ہیں۔ جو لوگ کچھ الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے کتاب و سنت کی ساری تصریحات کو ایک طرف سے الگ رکھ کر ان الفاظ سے شاعرانہ[1] اور فلسفیانہ قسم کے فقرے برآمد کرتے ہیں، پھر اپنے ان فقروں سے کچھ اور نتائج نکالتے ہیں،

---

[1] بطورِ مثال اس طرح کا ایک فقرہ یہاں درج کیا جاتا ہے: "قانونِ خداوندی کے مطابق قائم کردہ نظام میں افراد کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس میں افراد کا فریضہ نوعِ انسانی کی ربوبیت (نشوونما) ہے" ــــــ ملاحظہ فرمایا آپ نے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

پھر ان نتائج سے ایک معاشی نظام گھڑتے ہیں، پھر اس معاشی نظام کے مطابق احکام نکالتے ہیں، وہ اپنی خیال آرائیوں کے خود ذمے دار ہیں۔

اس بحث کو جاری رکھنے کے لئے جب اور کوئی راستہ نہیں ملتا تو آخر کار لوگ آیتِ کنز کو لے کر آتے ہیں کہ دیکھیے اس کی رو سے سونے چاندی کی کوئی مقدار جمع کر کے رکھنا ممنوع ہے۔

آیتِ کنز سورۂ توبہ میں ایک ایسے محلِ کلام میں آئی ہے جہاں حق و باطل کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ احبار و رہبان یعنی (بنی اسرائیل کے) صوفیا و علما جنھیں دینِ حق کا ہمہ تن خادم ہونا چاہیے تھا اب اس پستی میں آگرے ہیں کہ اسی دین کے نام سے حرام کمائیاں کرتے ہیں اور پھر ان کمائیوں سے سونے چاندی کے جو انبار جمع کرتے ہیں ان کو بھی خود دینِ برحق کو غالب کرنے والی تحریک کا راستہ روکنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب ان لوگوں پر بات کو بالکل چسپاں کرتے ہوئے یہ کہا جا رہا ہے کہ مال و دولت کی قوت کو جو لوگ اس طرح سمیٹے بیٹھے ہیں، ان کو جان لینا چاہیے کہ جب تک وہ اسے راہِ حق میں استعمال نہ کریں، وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو عذابِ الیم کی "بشارت" دی جائے۔

اس سے بلاشبہ یہ بات بھی نتیجۃً اخذ ہوتی ہے کہ مسلم سوسائٹی میں جو لوگ اپنے اموال کو سینت سینت کر ان پر سانپ بنے بیٹھے رہیں، درانحالیکہ ان کے روبرو خدا کا دین موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہو اور یہ کشمکش کہہ رہی ہو کہ اغنیا اپنے اموال کو لائیں اور کوڑی کوڑی "فی سبیل اللہ" صرف کر دیں تو وہ آخرت میں سخت گرفت کے مستحق ہوں گے۔ چنانچہ اس تنبیہ کا یہ اثر صحابہ کی سوسائٹی پر رونما ہوا تھا کہ مالدار لوگ متفکر ہو ہو کر آنحضور صلعم سے دریافت کرنے آئے کہ کیا سونے چاندی کی کوئی مقدار رکھنا ان کے لئے جائز نہیں رہا اور "کنز" ہر حال میں حرام ہے۔ اس کے جواب میں

(بقیہ صفحہ گزشتہ) "نوعِ انسانی کی ربوبیت" کی اصطلاح کو، اب اس اصطلاح سے ذہن میں جو شاعرانہ فضا بنتی ہے اُس کے پیٹ سے عجیب و غریب تصورات و تخیلات جنم لیتے ہیں، یہاں تک کہ آدمی خدا اور اس کی کتاب کو بھول کر ہمہ تن "نوعِ انسانی کی ربوبیت" کے خوشنما فلسفے کی کوچہ گردیوں میں کھو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ اسلام ہی ہوگا۔ کبھی ذرا سوچیے تو سہی کہ "افراد کا فریضہ نوعِ انسانی کی ربوبیت" کو آپ لے کہاں سے آئے؟

ان کو بتایا گیا کہ زکوٰۃ دینے کے بعد (جائز کمائی سے حاصل کردہ) سیم و زر کا کتناز کی اس ممنوع صورت سے خارج ہو جاتا ہے جس کے لئے اس آیت میں وعید آئی ہے۔ ورنہ اگر حدیث کی اس وضاحت کو نہ مانا جائے تو حسبِ ذیل نتائج برآمد کئے جا سکتے ہیں :-

ایک یہ کہ سونے چاندی کی کوئی چھوٹی یا بڑی مقدار (سکے، زیور یا ڈلی کی شکل میں) کسی کم یا زیادہ مدت کے لئے پاس رکھنا موجبِ وعید ہے۔

دوم یہ کہ سونے چاندی کی جو مقدار جس صورت میں بھی ہاتھ آئی ہو اسے پورے کا پورا صرف اللہ کے راستے میں خرچ ہونا چاہیے اور اپنی ضروریات پر اس میں سے کچھ خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔

سوم یہ کہ مستقبل کی ضروریات کے لئے کوئی شخص کسی مقدار میں سیم و زر کو پس انداز کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

چہارم یہ کہ سونے چاندی کے اوپر جو زکوٰۃ لگائی گئی ہے وہ بالکل فضول کارروائی تھی۔

چونکہ ان لغو نتائج سے کوئی شخص بھی ہوش و خرد کی بحالی کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا، اس لئے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اور علمائے متاخرین نے بالاتفاق نبی صلعم کی اس تفسیر پر ایمان لانے کا اقرار کیا ہے جو آنحضور نے اس آیت کی فرمائی اور جو عملاً نظام اسلامی میں رائج ہوئی۔ اس آیت کے تقاضے صرف یہ ہیں :-

اول: احبار و رہبان کے لئے جائز نہیں کہ وہ دین کے نام پر کچھ تقریبات پر، کچھ رسموں کی انجام دہی کے لئے، فیسوں اور نذرانوں کے تعین سے فتویٰ فروشی کے کاروبار سے اور اہلِ اقتدار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دین کے مقاصد میں تحریف کر کر کے ناجائز کمائیاں کریں۔

دوم: احبار و رہبان کے لئے خصوصاً اور دین کا نام لینے والوں کے لئے عموماً یہ طرزِ عمل انتہائی مکروہ ہے کہ وہ اپنے قویٰ ——— خصوصاً مالی قوت ——— کو خود دین کے غلبے کی کوششوں کو روکنے پر صرف کریں۔

سوم: اموالِ کنز میں سے باقاعدگی سے صدقاتِ واجبہ ادا کئے جائیں، نیز خدا کا دین اپنے بقا و استحکام کے لئے اہلِ مال سے جو مطالبہ رکھتا ہو اور اسلامی ریاست کی سرگرمیاں ان پر جو مالی بار ڈالیں ان کو وہ پورا کریں۔

بس ان تقاضوں سے آگے بڑھ کر اگر کوئی تحدید ایسی لگائی جائے جو سونے چاندی کی ملک کا حق ساقط کرتی یا اس کی کسی خاص مقدار سے زائد کو حرام ٹھیراتی ہو، شریعتِ اسلامی کے اندر کی چیز نہ ہو گی، باہر کی ہو گی۔

کیا قومی ملکیت کا اصول نظامِ اسلامی میں اختیار کیا جاسکتا ہے؟

قومی ملکیت کے اصول کو نظامِ اسلامی میں فٹ کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں، اور اس حرکت سے مفید نتائج نکلیں گے یا مضر، اس سوال کا مفصل جواب میں اپنے پمفلٹ "قومی ملکیت" میں دے چکا ہوں۔

یہاں اصل میں سوال کی پیشِ نظر نوعیت یہ ہے کہ افراد کو جو حقوقِ ملکیت (متعینہ پابندیوں اور حدود کے ساتھ) خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کی تصریحات کے مطابق عطا کئے ہیں، کیا بروئے دستور و آئین ان کو مسلمانوں کی ایک ریاست ان سے سلب کرسکتی ہے؟

اسلامی اسٹیٹ میں پورا نظامِ حکومت درحقیقت اصل حاکم (خدا) کے مقابلے میں وائسرائے (نائب) کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس طرح کی ریاست کے دستور میں حکومت کے مقابلے میں افراد کو جو حقوق خود اصل حکمران کی طرف سے دے دیئے گئے ہیں ان کو اگر بیچ میں کام کرنے والا نائب کالعدم قرار دینا چاہے تو بجائے اس کے کہ اس نائب کو اپنا من مانا فیصلہ نافذ کرنے کا مجاز مانا جائے اسے تو اصل حکمران کا باغی قرار دیا جائے گا۔ وہ اگر ایسا کوئی فیصلہ کرے تو اس کے خلاف اسلامی عدلیہ (جو انتظامیہ کے مقابلے میں آزاد حیثیت رکھتا ہے اور اصل حکمران کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے براہِ راست جوابدہ ہے) سے فیصلۂ استرداد اور حکمِ امتناعی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مِلک کا حق اسلامی ریاست کے تسلیم کردہ بنیادی حقوقِ شہریت میں شامل ہے اور وہ بروئے دستور پورا پورا تحفظ اور پوری پوری گارنٹی چاہتا ہے۔ کیا اس بنیادی حقِ شہریت کے خلاف ہے کوئی دلیل؟

خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے فرمودات میں کوئی دلیل نہیں!

لیکن کہا جاتا ہے کہ ایک نظیر خلافتِ راشدہ کے دور کی ایسی موجود ہے جو بتاتی ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اسلامی ریاست کو مجاز قرار دیتی ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے عمومی مفاد کے لئے بعض کے خصوصی مفاد کو، اور اسی طرح آئندہ نسلوں کے مفاد کے لئے موجودہ نسل کے مفاد کو نظرانداز کرکے اپنی پالیسی بنائے۔

واقعہ یوں ہے کہ عراق کی زمین جب فتح ہوئی تو سوال پیدا ہوا کہ آیا اسے مالِ غنیمت کی حیثیت دے کر (⅕ حصہ ریاست کے عمومی کاموں کے لئے ریزرو رکھنے کے بعد) سپاہ میں تقسیم کر دیا جائے یا اسے عطائے

الٰہی کی حیثیت دے کر پوری طرح عوامی مفاد کے لئے محفوظ کر دیا جائے۔ اس پر اسلامی حکومت کی مجلس شوریٰ میں دونوں قسم کی رائیں سامنے آئیں اور مسلسل بحثیں ہوتی رہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ دینے میں بہت تامل کیا۔ پھر کھلا اجلاس طلب کیا اور مسلمانوں کے سامنے سارا معاملہ رکھتے ہوئے تقریر کی کہ:۔

فانی احد کاحدکم وانتم الیوم تقرون بالحق خالفنی من خالفنی ووافقنی من وافقنی ولست ارید ان تتبعوا هذا الذی هوای معکم من اللہ کتاب ینطق بالحق، فواللہ لئن کنت نطقت بامر ارید به الا الحق۔ (کتاب الخراج ص ۲۵)

میں تمہاری ہی طرح کا ایک فرد ہوں، اور آج جبکہ تم کو ایک حق کا فیصلہ کرنا ہے، بعض لوگ میری رائے کے حامی ہیں، بعض مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری خواہش کے پیچھے چلو۔ تمہارے پاس خدا کی کتاب موجود ہے جو ہر معاملے میں حق کو ظاہر کرتی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں بجز حق کو چاہنے کے میرا کوئی دوسرا مدعا نہیں ہے۔

اسی تقریر میں آپ نے قرآن سے اپنا استدلال پیش کیا، لوگوں نے اس سے اتفاق کیا اور اس پر اجماع سے یہ فیصلہ ہوا کہ عراق کی زمین مسلمان لشکریوں میں تقسیم کرنے کے بجائے مجموعی مفاد کے لئے حکومت کے تصرف میں ہوگی۔

کہنے والا یہ سنتے ہی کہتا ہے کہ ثابت ہو گئی نا قومی ملکیت؟

ہم گزارش کرتے ہیں کہ یہ سارا معاملہ تھا غنیمت اور فئے کے قانون کی تعبیر اور اس کے انطباق کا، اس میں انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت کی بحث نہ تھی۔

قرآن میں دو قانون الگ الگ بیان ہوئے ہیں، ایک غنیمت کا ایک فئے کا۔

غنیمت کے قانون کے اہم اجزا سورۂ انفال میں یوں بیان ہوئے ہیں:۔

(۱) الانفال للہ والرسول ——— غنائم اصلاً خدا اور رسول کے ہیں، یعنی وہی ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں (ضمناً یہ مفہوم خود اخذ ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے بعد غنائم کے بارے میں ذمہ داری اس حکومتِ صالحہ کے سر عائد ہوتی ہے جو خدا اور رسول کے احکام کی اطاعت میں چلے)

(۲) واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ، وللرسول، ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل ــــــــ جنگی غنائم کا پانچواں حصہ لازماً حسبِ ذیل مقاصد کے لئے وقف رہنا چاہیئے:۔

(ا) خدا کے دین کی اقامت کے لئے۔

(ب) رسول اللہ (بحیثیت صدرِ حکومت کے) کی ضروریات اور آپؐ کی طرف سے اقربا کے حقوق کی ادائگی کیلئے

(ج) یتیموں اور اہلِ حاجت کی کفالت کے لئے۔

(د) مسافروں کو امداد اور سہولت دینے کے لئے۔

اب لیجئے قانونِ فئے کو، جس سے ذیل کی دفعات اخذ ہوتی ہیں:۔

(ا) فئے کی تعریف ــــــــ "ما افاء اللہ علیٰ رسولہ" جو کچھ خدا اپنے رسول (بحیثیت صدرِ حکومتِ اسلامی) کو (بفضلِ خاص) ہاتھ لگا دے یعنی خاص اس عطیۂ الٰہی کے لئے جدوجہد نہ کی گئی ہو، نہ کرائی گئی ہو، بلکہ بطور شئے زائد کے حاصل ہو جائے۔

(۲) فئے کا مصرف ــــــــ (ا) للہ۔ یعنی اللہ کے دین کے فروغ میں (ب) وللرسول ولذی القربیٰ۔ رسول اللہ (بحیثیت صدرِ حکومت) کی ضروریات اور آپؐ کے اقربا کے حقوق ادا کرنے میں (ج) والیتمیٰ والمساکین، یتیموں اور حاجتمندوں کی کفالت میں، (د) وابن السبیل، مسافروں کی اعانت و خدمت میں (ر) للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلاً من اللہ، خصوصاً ان وطن چھوڑنے والے بے سروساماں لوگوں کی بحالی میں جو گھروں اور املاک سے نکال دیئے گئے ہیں اور اب وہ اللہ کے فضل (رزق) کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، (س) والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم ولایجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ ــــــــ ان لوگوں کی مالی اعانت میں، جو اس گھر (مدینہ) میں مقیم ہیں اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لائے ہوئے ہیں، جو ہر اس شخص پر فدا ہیں جو ہجرت کر کے ان تک آتا ہے، اور وہ اپنے مال سے (ان کی خاطر) بے نیاز ہیں، اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے خود ان پر فاقہ ہی کیوں نہ مسلط ہو رہا ہو! (ص) والذین جاؤ من بعدھم، اور ان لوگوں کے مفاد میں، جو ان سب کے بعد (آئندہ نسلوں میں) آنے والے ہیں۔

(۳) حکومت کا تصرفِ خاص ـــــ وما اٰتکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا ـــــ
اور رسول (بہ حیثیت صدرِ حکومت) مالِ فئے میں سے اگر کوئی حصہ دے تو وہ جتنا دیدے اسے قبول کرلو، اور جس حصے سے تمہیں روک کر اسے بیت المال میں مفادِ عامہ کے لئے داخل کرنا چاہے، اُس سے رُک جاؤ۔

(۴) اس ضابطۂ فئے کی غایت ـــــ کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ـــــ
یہ اموال فئے کہیں دولتمندوں کے اوپر اوپر کے طبقے ہی میں گردش کرتے نہ رہ جائیں۔

اب سنیئے کہ معاملہ تھا کیا؟

دراصل شورائے فاروقی میں مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ عراق کی مفتوحہ زمین کا فیصلہ ان دونوں میں سے کس قانون کے تحت ہونا چاہیئے۔ غنیمت کے قانون کے تحت یا فئے کے قانون کے تحت؟ لمبی بحثوں کے بعد قانونِ فئے کو زمینِ عراق پر منطبق کیا گیا اور اسے غنیمت کی تعریف سے خارج قرار دیا گیا۔

آپ ہی بتائیے کہ یہاں انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت کی بحث کا کیا مقام؟ ـــــ اور پھر سوچیئے کہ جن لوگوں کو یہی معلوم نہ ہو کہ شورائے فاروقی میں بحث تھی کس سوال پر، وہ جب اس شوریٰ کے فیصلے سے اجتہادی احکام نکالنے پر اتر آئیں تو کیا کیا عجائبات ظہور میں نہ آئیں گے۔

اس سارے معاملے کو اور مختصر کرکے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عراق کی زمین پر جو بھی فیصلہ دیا ہو اور جس طرح بھی دیا ہو، آخر اس سے یہ کیسے قیاس کرلیا جائے کہ مسلم افراد کی مِلک میں پہلے سے جو اموال ہوں ان کو بھی قومی ملکیت میں منتقل کیا جاسکتا ہے؟ اس کی کوئی نظیر اگر ہو تو اسے سامنے لائیے۔ پھر گفتگو سیدھے راستے پر چل سکتی ہے۔

یہاں آکر جب نصوص ونظائر کے ترکش خالی ہوجاتے ہیں تو پھر ایک اور دروازہ بنایا جاتا ہے کہ اس راستے سے قومی ملکیت کا اصول اسلام میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ وہ دروازہ ہے اسلامی شوریٰ کے اجماع کا۔ لیکن جب ہم گزارش کرتے ہیں کہ شوریٰ تو ریاست کا ایک عضو (ORGAN) ہے، جب پوری حکومت خدا کے دیئے ہوئے حق کو سلب کرنے کی مجاز نہیں ہے تو مجلسِ شوریٰ کا اجماع دستورِ اسلامی کی رو سے جائز (VALID) کیسے ہوگا۔ اسے تو عدالت کا فیصلہ رَدّی کے پرزے میں بدل سکتا ہے۔ اب ایک صورت اور سامنے لائی جاتی؟

کہ اگر استصوابِ عام کر کے ہر شہری کا اتفاقِ رائے حاصل کر لیا جائے تو ؟

یہ یقیناً دستوراً جائز ہے کہ اسلامی ریاست کے کچھ یا بیشتر شہری اپنی کسی ملک سے خود دست بردار ہو کر اسے حوالۂ حکومت کر دیں، لیکن دوسری طرف اگر کچھ شہری اس پر تیار نہ ہوں تو ان کو مجبور کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے، حتیٰ کہ اگر ایک شہری بھی چاہے کہ اپنی ملک پر قبضہ قائم رکھے تو وہ رکھ سکتا ہے اور عدالت اس کی حفاظت (PROTACTION) کی ضامن ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ اکثریت کا فیصلہ اقلیت کو ماننا لازم ہے، جیسا کہ "اجماع" کے متعلق دستورِ اسلامی چاہتا ہے کہ اسے واجب سمجھا جائے لیکن "اجماع" کسی متعین و منصوص حق کو (خصوصاً حقوقِ شہریت کو) کالعدم قرار دینے کا مجاز نہیں ہے، ورنہ اگر نصوص کو منسوخ کرنے کے لئے اجماع کو مؤثر مان لیا جائے تو پھر شریعت کا کوئی اصولی اور تفصیلی حکم اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔

املاک رکھنے کا حق جو فرد کو حاصل ہے، وہ خدا کا اپنا قائم کردہ ہے اور اس کے بارے میں رسول اللہ نے واضح طور پر وصیت فرمائی ہے کہ اعراضکم حرام علیکم۔ تمہارے اموال و املاک حرام قرار دیئے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سو آدمیوں میں سے ۹۰ کے ووٹوں سے طے کردہ فیصلہ بھی بقیہ ۱۰ کے حقِ ملک کو ساقط کرنے کے لئے مؤثر نہیں ہے، کیونکہ یہ فیصلۂ اکثریت خود دستور سے ٹکراتا ہے بالفرض ایک وقت میں اگر اپنے املاک کو سارے شہری حکومت کے حوالے کرنے پر رضامند ہو بھی جائیں تو بھی دستور نے املاک رکھنے کا جو حق ان کو دیا ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ وہ از سرِ نو املاک بہم پہنچا سکتے ہیں۔

پس یہ معاملہ رضا کارانہ ایثار اور اخلاقی فیاضی سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ دستور و قانون کے جبری ذرائع سے!

ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ ملک رکھنے کا حق ہی تو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، آخر افراد کے لئے اسے واجب تو نہیں ٹھیرایا کہ لازماً املاک رکھو پس جو چیز ضروری نہیں اسے جاری رکھنے کی ذمہ دار ریاست کیوں ہو گی ؟

---

* قصاص کا حق اللہ تعالیٰ نے شہریوں کو عطا کیا ہے کہ وہ چاہیں تو ثبوتِ تعدی پر برابر کا بدلہ لیں اور چاہیں تو دیت پر معاملہ کر لیں چاہیں تو معاف کر دیں! اس حق کو بھی افراد کے لئے مباح غیر واجب قرار دیکر کیا استصوابِ عام کے ذریعے اکثریت کے ووٹ سے سلب کیا جا سکتا ہے؟ اس اصول کو ذرا تمام حقوق پر منطبق کر کے دیکھئے!

ہم سمجھتے ہیں کہ بنیادی حقوق میں سے "ہر حق" کو قائم رکھنا ضروری اور واجب ہے، ان میں خلل ڈالنے سے توازن ختم ہوتا ہے جو ریاست اور عوام یا سوسائٹی اور افراد کے درمیان قائم کیا گیا ہے اور جو اسلامی نظام حیات کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ ورنہ اگر دوسری طرح سوچا جائے تو پھر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حسب منشا گھر میں کھانا پکوانا، لباس کے لئے کوئی جائز تراش منتخب کرنا، اپنے لئے پیشہ پسند کرنا، علم وادب میں اضافے کرنا، نئی نئی ایجادات کرنا، کسی سفر پر نکلنا، وغیرہ سارے امور مباحات ہی تو ہیں، واجب تو نہیں کیے گئے، اگر ریاست ان چیزوں پر پابندی عائد کرنا چاہے یا ان کو روک دے تو اس کا یہ اقدام جائز ہوگا، اگر معاملہ اسی طرح آگے بڑھتا جائے تو پھر کہنا یہ چاہیئے کہ آزادی ـــــ سوائے حق بات کہنے اور عبادات کی بجاآوری کے ـــــ اور ہر معاملے میں محض مباح حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا حکومت چاہے تو اسے سلب کرے کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔

اگر غور سے کام لیا جائے تو یہ نظریہ کہ مباحات غیر واجب کو حکومت حرام قرار دے سکنے کی مجاز ہے، سارے حقوقِ شہریت کا خاتمہ کر سکتا ہے اور پورے نظامِ دین میں ہر طرف تاویل و تحریف کے دروازے کھول دیتا ہے۔

بالفرض کچھ مباحات اگر ایسے ہوں بھی کہ ان میں ریاست کی مداخلت کی گنجائش ہو تو ان کے بارے میں بھی شریعت کا مزاج غیر معمولی ضابطہ بندی (CODIFICATION) کے خلاف اور انفرادی آزادی کو زیادہ سے زیادہ حد تک برقرار رکھنے کی طرف ہے۔ قرآن میں مسلمانوں کو سوال بازی سے روکنے کی علت یہ بیان کی گئی تھی کہ اس طرح تم اپنے لئے بہت سی جکڑ بندیاں فراہم کر لو گے اور پھر اپنا بوجھا اتنا بڑھا لو گے کہ ایک دن سارے کا سارا اتار کے پھینک دو گے۔ پس ان مباحات میں بھی جن کا تعلق "بنیادی حقوق" سے نہیں ہے حکومت کو شدید داعیات کے تحت کم سے کم ناگزیر حد تک ہی تصرف کرنا چاہیئے اور جب بھی پابندیوں کو ہٹانے کے لئے حالات سازگار ہو جائیں تو انہیں ہٹا دینا چاہیئے۔

اسلام دراصل نظامِ اجتماعی کی عام فضا ایسی رکھنا چاہتا ہے کہ اس میں کلمۂ حق بلند کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینے کے لئے پوری سہولتیں افراد، جماعتوں اور اداروں کو حاصل رہیں۔ اسی

فضا کی بحالی کے لئے چند حقوقِ شہریت وہ عوام کے لئے مقرر کرتا ہے اور خصوصیت سے آزادی رائے اور آزادی ملک کے حقوق کو باہم لازم ملزوم کی حیثیت دیتا ہے۔ قومی ملکیت کے تحت یہ فضا ختم ہو جاتی ہے۔

آپ بتائیے کہ اگر اظہارِ خیال کے ذرائع (پریس، اخبارات، مکتبے، دارالاشاعت، ہال، میدان، اور پارک) سب کے سب حکومت کے تصرف میں ہوں، نیز جملہ ذرائع پیداوار اور جملہ پیشے اس کے تحت ہوں، قیمتوں اور راشننگ کا نظم اس کے قبضے میں ہو تو کیا یہ ممکن ہے کہ حکومت کی روش کے خلاف (جسے بہر حال حکمران طاقت عینِ حق اور عینِ شریعت قرار دے گی) کوئی آواز اٹھائی جا سکے ــــــ جبکہ حکمران طاقت اس کو روکنا چاہے! قطعاً نہیں! پس قومی ملکیت کا نظام اپنی فطرت کے لحاظ سے غیر اسلامی ہے۔

اس پر کہا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت (خود تمہارے عندیئے کے مطابق بھی) صالحین کے ہاتھوں میں ہوگی، پھر اس بات کا خدشہ کیوں ہو کہ صالحین ظلم کریں گے اور حق کی آواز کو دبا دیں گے۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ اول تو ایک دستور بننے کے بعد اسلامی ریاست کو ایک عبوری دور طے کرنا ہوگا جس میں چند صالحین، چند ادھکچرے اور بہت سے عامیانہ قسم کے کارکن مل جل کر کام کریں گے۔ اس عبوری دور میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ قومی ملکیت کا نظریہ اختیار کرنے والی ریاست کیسے ارتقا کرے گی۔ پھر صالحین بلا کسی مزاحمت و مسابقت کے تو نہیں چلیں گے۔ ان کی مزاحمت کرنے کے لئے غیر اسلامی رجحانات بھی کام کریں گے اور قومی ملکیت کے نظام کو اشتراکی ملحدانہ خطوط کی طرف دھکیلنے والے عوامل بھی موجود ہوں گے۔ اب اگر اس کشمکش میں "قومی ملکیت" کے نظام ہمہ گیر کی باگ ڈور کسی ذریعے سے غلط ہاتھوں میں منتقل ہو گئی تو آپ اس کا راستہ روکیں گے کن ذرائع سے؟

پھر فرض کیجئے کہ ٹھیٹھ قسم کے صالحین قومی ملکیت کے نظام پر متمکن ہوتے ہیں اور رہتے ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایک صالح طاقت کے بعد لازماً ہر طاقت جو جانشینی کرے گی صالح ہی ہوگی؟ ــــــ اگر کبھی دس سال، بیس سال، پچاس سال میں آپ کے ملک کے صالح "ڈکٹیٹر" (قومی ملکیت کے نظام میں ڈکٹیٹر شپ تو پیدا ہوتی ہے) کی جگہ غیر صالح ڈکٹیٹر آتا ہے یا اس کی کونسل میں اکثریت دوسرے دل ودماغ کے لوگوں کی داخل ہو جاتی ہے اور نظام کو بگاڑا جاتا ہے۔ اب آپ کریں گے کیا؟

ایسے موقعوں پر ایک طریقہ ہوتا ہے رائے عام کے احتجاج کا اور اس کا راستہ روک دیا جائے تو دوسرا راستہ ہوتا ہے بغاوت کا! اب سوچ کر بتائیے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے لئے کبھی قومی ملکیت کے نظام میں آپ کو ذرائع و وسائل مل سکتے ہیں ــــــ اگر حکمران خود ہی بطور فیاضی اپنے خلاف استعمال کرنے کے لئے کوئی قوت عطا نہ کردے؟

اب پلٹ کے جواب دیا جاتا ہے کہ تم نظام اسلامی کا جو خاکہ پیش کرتے ہو اس میں بھی تو خیر و فلاح حکمرانوں کے صالح ہونے سے مشروط ہے۔ یہی بات ہمارے قومی ملکیت کے نظام میں بھی ہوگی۔ یہاں بھی شرط وہی ہے۔ لیکن ہم جو نظام دیتے ہیں اس میں حکمران بگڑ جائے تو منظم احتجاج، بلکہ آئینی انقلاب کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ اور راستے ہی سے کام نہ چلے تو پھر "خروج" تک کی گنجائش رہتی ہے۔

آخر کار اس بحث کے خاتمے پر ایک بات اور سامنے لائی جاتی ہے کہ ہم سارے ذرائع و وسائل کو قومی ملکیت میں دیں گے ہی نہیں، بعض دیں گے۔ لیکن ہم عرض کرتے ہیں کہ اس طرح کا ادھورا قومی ملکیت کا نظام دنیا میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکا حتیٰ کہ برطانیہ جیسے منظم ملک میں وہ موجب نقصان (پیدائش دولت کی کمی) ثابت ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اس اصول کو اختیار کیا جاتا ہے وہاں آغاز اس کے محدود انطباق سے ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ وسعت اختیار کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ذرائع و وسائل کا باہمی ربط اتنا گہرا ہے کہ ایک شعبے پر کنٹرول کرنے کے لئے دوسرے پر کنٹرول کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام نظام حق کو جاری رکھنے کے لئے آزادی کی فضا چاہتا ہے اور وہ قومی ملکیت کے اصول کے تحت یہ ختم ہو جاتی ہے۔

ان دلائل کے ساتھ ہم اس نتیجے میں پہنچتے ہیں کہ اسلامی نظام میں قومی ملکیت کا اصول داخل نہیں کیا جا سکتا۔ جو اس نتیجے سے اختلاف کرنا چاہے کرے، لیکن ہم اس سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے موقف کے حق میں کوئی منظم استدلال کرے، جس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہو۔

(باقی آئندہ)

بقیہ اشارات

وجہ سے گوشہ گیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور دنیا کے کاروبار اُن بُرے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتے ہیں جن کی زبان پر نیکی کا نام اگر کبھی آتا بھی ہے تو صرف خلق خدا کو دھوکا دینے کے لئے آتا ہے۔ اس خرابی کا علاج صرف یہی ہے کہ صالحین کی ایک جماعت منظم کی جائے جو خدا ترس بھی ہو، راست باز اور دیانتدار بھی ہو، خدا کے پسندیدہ اخلاق و اوصاف سے بھی آراستہ ہو، اور اس کے ساتھ دُنیا کے معاملات کو دنیا داروں سے زیادہ اچھی طرح سمجھے اور خود دنیا داری ہی میں اپنی مہارت و قابلیت سے ان کو شکست دے سکے۔ ہمارے نزدیک اس سے بڑا اور کوئی سیاسی کام نہیں ہو سکتا اور نہ اس سے زیادہ کامیاب سیاسی تحریک اور کوئی ہو سکتی ہے کہ ایسے ایک صالح گروہ کو منظم کر لیا جائے۔ بداخلاق اور بے اصول لوگوں کے لئے دنیا کی چراگاہ میں بس اُسی وقت تک چرچُگ لینے کی مہلت ہے جب تک ایسا گروہ تیار نہیں ہو جاتا۔ جب ایسا گروہ تیار ہو جائیگا تو آپ یقین رکھیئے کہ نہ صرف آپ کے اس ملک کی، بلکہ بتدریج ساری دنیا کی سیاست، معیشت، مالیات، علوم و آداب اور عدل و انصاف کی باگیں اُسی کے ہاتھ میں آجائیں گی اور فساق و فجار کا چراغ ان کے آگے نہ چل سکے گا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ انقلاب کس طرح رونما ہوگا۔ لیکن جتنا مجھے کل سورج کے طلوع ہونے کا یقین ہے اتنا ہی اس بات کا یقین بھی ہے کہ یہ انقلاب بہر حال رونما ہو کر رہے گا بشرطیکہ ہمیں صالحین کے ایسے گروہ کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔" (ایضاً صفحہ ۷۸-۷۹)

یہ طویل اقتباسات جو سب کے سب تشکیلِ جماعت کے ابتدائی دور کی تحریروں اور تقریروں سے لئے گئے ہیں، اُس مقصد کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں جس کے لئے جماعت کی تاسیس اور کارکنوں کی تنظیم و تربیت کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ جو حضرات اس کام کو سمجھنا چاہیں وہ ہماری حسب ذیل مطبوعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں:

۱۹۳۹ء۔ مسئلہ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔

۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء، روداد جماعت حصہ اول۔

۱۹۴۴ء، روداد جماعت حصہ دوم۔

۱۹۴۵ء، دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں، روداد جماعت حصہ سوم۔

۱۹۴۷ء، روداد جماعت حصہ پنجم، ہندوستان میں تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل۔

ان چیزوں کے مطالعہ سے ناظرین کو نہ صرف یہ معلوم ہو جائے گا کہ تشکیل جماعت سے ہمارا مقصد کیا تھا، بلکہ وہ یہ بھی جان لیں گے کہ اگست ۱۹۴۱ء سے اگست ۱۹۴۷ء تک کے پورے چھ سال ہم نے کس کام میں گزارے ہمارا طریق تنظیم کیا تھا، ہم نے اپنی جماعت میں کس قسم کا ڈسپلن قائم کیا تھا، ہم کس طریقے سے آدمیوں کو چھانٹ چھانٹ کر لیتے اور کس طرح ناکارہ اشخاص کو چھانٹ کر الگ کرتے رہے، اور مردانِ کار کی تربیت کے لئے کس نوعیت کی تدبیریں ہم نے اختیار کیں اور کیا کچھ کرنا چاہتے تھے جسے عمل میں نہ لا سکے۔ یہ سب کچھ ان مطبوعات کے آئینے میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

ایک شخص چاہے تو جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس سارے کام پر چند طعن آمیز فقروں سے یا چند جھوٹے الزامات سے پانی پھیر سکتا ہے۔ لیکن یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے اس دنیا کے نظام کو قائم ہی کچھ ایسے قوانین پر فرما دیا ہے کہ یہاں پھونکوں سے پہاڑ نہیں اڑائے جا سکتے اور الفاظ سے حقیقتیں نہیں بدلی جا سکتیں۔

رسائل و مسائل

اسلام کے مآخذِ قانون اور تعبیر و اجتہاد

سوال:

ڈاکٹر محمصانی، بیروت کے پروفیسر برائے قانون، جو حکومت پاکستان کی دعوت پر اس ملک میں تشریف لائے، انھوں نے اسلامی قانون پر کراچی میں ایک تقریر کی۔ عرب ممالک میں قانونی ارتقا کے تین ادوار، خلافتِ دورِ عثمانی اور جدید زمانے کا تذکرہ کر کے انھوں نے اس پر بحث کی کہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق اسلامی قانون میں تبدیلی ممکن ہے یا نہیں۔ ان کی بحث کا ماحصل یہ تھا کہ اسلامی قانون کے دو حصے ہیں: ایک خالص مذہبی، دوسرے معاشرتی۔ جہاں تک مذہبی قانون کا تعلق ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ کبھی نہ بدلنے والے حقائق پر مشتمل ہے، مثلاً توحید، عبادات وغیرہ۔ معاشرتی قانون دو مآخذ پر مبنی ہے: ایک اجتہاد، اور دوسرے قرآن و حدیث۔ اجتہاد ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور بدلنا چاہیے۔ احادیث میں سب سے پہلے سوال صحیح و غیر صحیح کا ہے، پھر صحیح احادیث بھی دو قسم کی ہیں: لازمی (OBLIGATERY) اور اختیاری یا مشاورتی (PERMISSIVE) پس آخر کار بحث ان احکام کی رہ جاتی ہے جو یا تو قرآن پر یا صحیح لازمی احادیث پر مبنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ان دونوں چیزوں کے ——— الفاظ کو نہیں (کیونکہ وہ علیٰ حالہٖ موجود ہیں اور تبدیل نہیں کیے جاسکتے) ——— سوسائٹی کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئی تعبیر (INTERPRETATION) دی جاسکتی ہے؟ ڈاکٹر محمصانی نے کہا کہ اس بارے میں فقہا کے دو گروہ ہیں: (۱) اکثریت کی رائے یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیح کو نئے معنی نہیں پہنائے جاسکتے (۲) قلیت کا استدلال یہ ہے کہ قانون ایک معاشرتی عمرانی سائنس ہے، لہٰذا جیسے جیسے معاشرت و عمران میں تبدیلی ہوتی جائے قانون کو بھی بدلنا چاہیے، ورنہ وہ زمانے سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھے گا۔ اسلام ترقی، تہذیب اور بہبودِ عامہ کا دین ہے

اور اس کی یہ خصوصیات باقی نہیں رہتیں یا اگر ہم اس بارے میں قدامت کا رویہ اختیار کریں۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے دو مثالیں بطور نمونہ پیش کیں اور بتایا کہ نہایت کثرت سے انھوں نے ایسی نظیریں اپنی کتاب (PHILOSOPHY OF ISLAMIC JURISPRUDANCE) میں دی ہیں۔

پہلی مثال یہ تھی کہ ایک حدیث صحیح میں گیہوں اور جو، دقیق اشیا کے پیمانے سے ناپنے کا تذکرہ ہے کیونکہ اس زمانے میں یہی رواج تھا، بعد کو جب وزن کے حساب سے یہ چیزیں فروخت ہونے لگیں تو ایک شخص نے امام ابو یوسف سے استفسار کیا، انھوں نے کہا کہ وہ معاہدہ جو وزن کے پیمانے سے ہوا ہو جائز ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ رواج کے بدل جانے سے احادیث کی تعبیر یا اطلاق میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

دوسری مثال جس کے ذریعے ڈاکٹر صاحب نے استدلال کیا کہ نہ صرف حدیث بلکہ قرآن کے الفاظ کو سوسائٹی کی ضروریات بدل جانے پر نئی تعبیر دی جا سکتی ہے، یہ تھی کہ قرآن میں صدقات کے مصارف میں مؤلفۃ القلوب کا بھی ایک حصہ رکھا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب نومسلموں کو صدقات میں سے کچھ دینے سے انکار کر دیا تو انھوں نے قرآن کی آیت سند میں پیش کی کہ یہ تو ہمارا حق ہے جو قرآن نے مقرر کیا ہے، آپ اسے کیسے ختم کر سکتے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواباً کہا کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت اسلام کمزور تھا، اس لئے اس کی ضرورت تھی، اب اسلام خدا کے فضل سے قوی ہے، لہٰذا اب ضرورت باقی نہیں رہی، پس میں تم کو یہ حصہ نہیں دوں گا۔

اس قسم کی مثالوں میں ایک معاملہ قطع ید کا بھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو جس نے بیت المال میں چوری کی تھی، اور دوسرے کو جس نے اپنے آقا کا مال چرایا تھا، قطع ید کی سزا نہیں دی، اس دلیل سے کہ ان کا اس مال میں حصہ تھا۔ اسی طرح قحط کے زمانے میں آپ نے اس سزا کو موقوف کر دیا۔

ڈاکٹر سہسانی نے دوران تقریر میں قانون کے چار ماٰخذ بتائے: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔

میرے ذہن میں ان کی تقریر کے بعد مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:-

(۱) متذکرہ بالا چار ماٰخذ کے علاوہ اور کونسی چیزیں ماٰخذ قانون ہیں؟ کیا علت، دوسرے ممالک کے رواج، عرف، عادت، تعامل، سنن، سبق، عموم البلویٰ، صاحب امر کی ہدایات، معاہدات وغیرہ کو ماٰخذ قانون

بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ فقہاء نے ان تمام کو مآخذِ قانون کی فہرست میں تو نہیں لکھا لیکن دورانِ بحث میں ان تمام کا تذکرہ مآخذِ قانون کی حیثیت سے کیا ہے، اور خلفائے راشدین کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، مثلاً حضرت عمرؓ نے زراعت و مالیاتی قانون میں شامی، مصری اور ایرانی قانون کی پیروی کی، رجسٹر اور حساب رکھنے کے طریقے ان سے اخذ کیے، غیر اسلامی حکومت کے تاجروں پر اتنا محصول عائد کیا جتنا کہ ان کی حکومتیں مسلمان تاجروں پر عائد کرتی تھیں ——— تو کیا اس سے یہ اصول مستنبط نہیں ہوتا کہ قرآن و حدیث کی مقرر کردہ حدود کے اندر دوسرے ممالک کے قانون سے استفادہ، اور نہ صرف استفادہ بلکہ اس کو بعینہٖ اخذ کیا جا سکتا ہے؟ حضرت عثمانؓ کا عمل تو کم از کم یہی ثابت کرتا ہے۔ آج اگر اسلامی حکومت وجود میں آئے تو کیا وہ مغربی ممالک کی سیاسی، معاشرتی، ادبی، اقتصادی اور سائنٹفک ترقیات کو نظر انداز کر کے نئے سرے سے اپنی عمارت کی بنیاد رکھے گی، محض اس غلط تصور اور تعصب کی بنا پر کہ جو کچھ مغرب سے آیا ہے وہ غلط ہے؟ کیا یہ تصور بالکل اسی طرح غلط نہیں کہ جو کچھ مغرب سے آیا وہی صحیح ہے؟ اگر یہ ایک انتہا ہے تو وہ دوسری انتہا ہے۔ پھر کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ مغرب کی جو باتیں شریعت کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہیں ان کو بعینہٖ، یا ان میں ادل بدل کر کے، لے لیا جائے؟

(۲) بزرگانِ سلف اور ائمہ نے جو اجتہادات کیے، اگر ان مسائل میں کوئی تبدیلی و اضافہ ممکن نہیں تو ان کو اختیار کر لیا جائے، ورنہ زمانہ کی بدلی ہوئی ضروریات کے مطابق ان کا اجتہاد کچھ مسائل میں اگر سازگار نہ رہا ہو تو آج کے فقہاء از سرِ نو اجتہاد کریں جو دورِ حاضر کی ضروریات کے مطابق ہو۔

(۳) کیا قرآن و حدیث کے الفاظ کو تبدیل کیے بغیر سوسائٹی اور معاشرت کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق ان دو مآخذ کے الفاظ کی تعبیر میں تبدیلی، اضافہ یا کمی کی جا سکتی ہے؟ مثلاً جیسا کہ مؤلفۃ القلوب کی مثال سے ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کے مسائل آج بھی پیدا ہو سکتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ان احکام و مسائل میں جو نصوصِ قرآنیہ یا احادیث لازمی پر مبنی ہیں، زمانے کی ضروریات اور ان احکام کی علت بدل جانے پر ایسے نئے احکام مستنبط کیے جا سکتے ہیں جو اسلام کی روح کے مطابق ہوں۔ آخر فقہاء ہی کا یہ متفق علیہ مسلک ہے کہ ہر حکم کی ایک علت ہے اور فلاحِ عامہ بہر حال مقدم ہے۔

مثلاً زکوٰۃ کا حکم قرآن شریف میں مذکور ہے لیکن زکوٰۃ کی کوئی شرح مذکور نہیں۔ احادیث میں جو شرح مذکور ہے وہ اس زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی۔ اب ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا زکوٰۃ کو ملک کے عام ریونیو یا ٹیکس کی حیثیت حاصل ہے (جبکہ حکومت اسلامی ہو)؟ اگر ہے تو دوسرا سوال شرح کا ہے کہ آج کے مالیاتی تقاضے قدیم شرح سے پورے نہیں ہو سکتے۔

ان سوالات سے ہٹ کر ایک دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن آیا ایک کوڈ ہے یا نہیں؟ بظاہر قانونی اعتبار سے قرآن ایک ترمیمی ضابطہ (AMENDING CODE) کی حیثیت رکھتا ہے جس نے بہت سے اُن رواجوں اور دستوروں کو قائم رکھا جو عرب میں جاری تھے، سب میں انقلاب پیدا نہیں کیا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن ایک مکمل کوڈ ہے، کس حد تک درست یا غلط ہے؟

جواب:

آپ نے جن مسائل کے متعلق اظہارِ رائے کی فرمائش کی ہے میں اُن پر "حقوق الزوجین"، "سود" اور "اسلامی قانون" میں ایک حد تک مفصل بحث کر چکا ہوں۔ آپ ان کتابوں کو ملاحظہ فرمائیں کہ کون سے پہلو تشنہ رہ گئے ہیں جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ باقی رہے آپ کے سوالات تو ان کے متعلق مختصر طور پر اپنے خیالات عرض کئے دیتا ہوں۔

(۱) علت، عرف، عادت، تعامل، سنن القبل، عموم بلویٰ، صاحبِ امر کی ہدایات، معاہدات اور ممالکِ غیر کے رواجات بجائے خود ماخذِ قانون نہیں بن سکتے، بلکہ یہ سب اجماع اور قیاس کے ضمن ہی میں داخل ہوں گے۔ اور خود اجماع و قیاس بھی اصل ماخذِ قانون نہیں ہیں بلکہ قرآن و سنت کے تابع ہیں۔ اجماع ہو یا قیاس، دونوں صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتے ہیں جبکہ استدلال کی بنا قرآن و سنت کے امر و نہی یا اباحت پر رکھی گئی ہو۔ امر و نہی کے معاملے میں قیاس و اجتہاد کو لامحالہ نصوص کا پابند ہونا پڑے گا، اور جس قیاس و اجتہاد پر اجماع ہو جائے، یا جمہور متفق ہو جائیں وہی ملک کا قانون بن جائے گا۔ رہے مباحات تو ان کے دائرے میں ہم بیرونی ممالک کے طریقوں سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں، اپنے ملک کے عرف و رواج کو بھی برقرار رکھ سکتے ہیں، عمومِ بلویٰ کا لحاظ بھی کر سکتے ہیں اور دوسرے مآخذ کی طرف بھی رجوع کر سکتے ہیں، بشرطیکہ جو قوانین بھی ہم

بنائیں وہ بحیثیت مجموعی اسلامی زندگی سے مطابقت رکھتے ہوں۔

(۲) بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو آئین قانون قرار دیئے جا سکتے ہیں، اور نہ سب کے سب دریابرد کردینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے، مگر صرف بقدرِ ضرورت اور اس شرط کے ساتھ کہ جو رد و بدل بھی کیا جائے دلائلِ شرعیہ کی بنا پر کیا جائے۔ نیز نئی ضروریات کے لئے نیا اجتہاد بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس کے لئے بھی شرط یہی ہے کہ اس اجتہاد کا ماخذ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ ہو اور یہ اجتہاد وہ لوگ کریں جو علم و بصیرت کے ساتھ جذبۂ اتباع و اطاعت بھی رکھتے ہوں۔ رہے وہ لوگ جو زمانۂ جدید کے رجحانات سے مغلوب ہو کر دین میں تحریف کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے حقِ اجتہاد کو تسلیم کرنے سے ہمیں قطعی انکار ہے۔

(۳) اصولی طور پر تو یہ بات صحیح ہے کہ احکامِ شرعیہ کے اجرا و نفاذ میں حالات کا لحاظ کرنا ضروری ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ نصوص کے الفاظ کی تعبیر میں اختلاف کی کافی گنجائش ہے، لیکن بحث اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اجمال کو چھوڑ کر ہم تفصیلات کی طرف آتے ہیں۔ یہاں متعدد تفصیلات ہمارے سامنے ایسی آتی ہیں جن میں تغیر پسند اصحاب کی تجاویز ہم کو حدِ جواز سے متجاوز نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہی زکوٰۃ کا معاملہ ہے جسے آپ نے مثال میں پیش کیا ہے۔ ہمارے نزدیک زکوٰۃ کو ملک کے عام ریونیو یا ٹیکس کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ ایک مالی عبادت ہے، اور اس کے لئے شارع نے جو نصاب، شرح اور مصارف مقرر کئے ہیں ان میں رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ اور جن چیزوں پر زکوٰۃ عائد کی گئی ہے ان میں بھی کمی بیشی ممکن نہیں ہے، الا یہ کہ کسی چیز کو شارع کی مقرر کردہ اشیاء پر قیاس کر لیا جائے۔ رہیں حکومت کی ضروریات تو ہم اس بات کے قائل ہیں کہ ایک اسلامی حکومت جمہور کی خدمت کے جن جن کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے ان کی انجام دہی کے لئے وہ جمہور پر ٹیکس لگا کر اپنے مصارف پورے کر سکتی ہے، بشرطیکہ ٹیکس انصاف کے ساتھ لگائے جائیں اور ایمانداری کے ساتھ ان کو خرچ کیا جائے۔

(۴) آپ کا آخری سوال کہ قرآن ایک "کوڈ" ہے یا نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کوڈ نہیں بلکہ کتابِ ہدایت ہے جس میں سوسائٹی کی اصلاح و تنظیم کے لئے قانونی ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ محض اس لئے کہ اس میں

قانونی ہدایات بھی ہیں، اس کو "کوڈ" کہہ دینا درست نہیں ہے۔ اور "مکمل کوڈ" کے لفظ سے اس کو تعبیر کرنا اور بھی زیادہ غلط ہے۔ جو بات صحیح طور پر کہی جا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن ایک مکمل کتابِ ہدایت ہے۔ (ا۔م)

برطانیہ میں ایک مسلمان طالب علم کے لئے مشکلات

سوال:

یہاں آکر میں کچھ عجیب سی مشکلات میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ سب سے زیادہ پریشانی کھانے کے معاملے میں پیش آرہی ہے۔ اب تک گوشت سے پرہیز کیا ہے، صرف سبزیوں پر گزارہ کر رہا ہوں۔ سبزی بھی یہاں آپ جانتے ہیں صرف ابلی ہوئی ملتی ہے اور وہ بھی زیادہ تر آلو۔ انڈا یوں بھی کمیاب ہے اور پھر اس پر راشن بندی ہے۔ ہفتے میں دو تین انڈے مل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد اللہ صاحب امام ووکنگ مسجد (لندن) سے ملا۔ انھوں نے یہ بتایا کہ کلام پاک کی رو سے ایک تو سؤر کا گوشت حرام ہے، دوسرے خون، تیسرے مردار اور چوتھے وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا جائے۔ پھر انھوں نے یہ بھی کہا کہ جہاں تک یہاں کے طریقۂ ذبح کا تعلق ہے اس سے شہ رگ کٹ جاتی ہے اور سارا خون نکل جاتا ہے، چونکہ اس خون کا نکلنا طبی نقطۂ نظر سے ضروری ہے، لہٰذا اس کا یہاں خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ البتہ یہ ضرور صحیح ہے کہ گردن پوری طرح الگ کر دی جاتی ہے، لیکن کلام پاک میں اس سلسلے میں کوئی ممانعت وارد نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہاں جانور کسی کے نام پر ذبح نہیں کئے جاتے، بلکہ وہ تجارتی مال کی حیثیت سے سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ ذبح ہوتے ہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اللہ کا نام تو نہیں لیا جاتا لیکن کسی اور کا بھی نام نہیں لیا جاتا، پس وہ غیر اللہ سے منسوب نہ ہونے کی وجہ سے کھایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے بہت کچھ بحث رہی مگر میری طبیعت نہیں مانتی کہ یہ گوشت جائز ہو سکتا ہے۔

پھر کھانے میں جو سوپ دیا جاتا ہے وہ کبھی کبھی تو صرف سبزیوں سے بنا ہوا ہوتا ہے، مگر آج ہی اتفاق سے اس میں ایک ٹکڑا گوشت کا نکل آیا۔ شکایت کی تو معلوم ہوا کہ کبھی کبھی گوشت اور سبزی ملا کر بھی سوپ

بنایا جاتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ جہاں سو دو سو آدمی اطمینان سے یہ سب کچھ کھا پی رہے ہوں وہاں دو چار آدمیوں کا لحاظ کون کرے گا؟ پھر مکھن، پنیر اور میٹھا کھانا بھی دسترخوانوں پر آتا ہے۔ ان چیزوں میں بھی حرام دودھ یا چربی کی آمیزش ہونے کے بارے میں قوی شبہ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں باورچی حرام کھانوں میں استعمال ہونیوالے چمچے اٹھا کر دوسرے کھانوں میں ڈالتے رہتے ہوں گے۔ یہ کچھ عجیب پیچیدگی ہے جسے حل کرنے میں مشورہ مطلوب ہے۔

دوسری بات نمازوں کے متعلق دریافت طلب ہے۔ صبح کی نماز کا وقت ۶ بج کر ۳۸ منٹ تک رہتا ہے یہ تو اللہ کے فضل و کرم سے ادا کر لیتا ہوں۔ ظہر کے لئے مشکل سے وقت ملتا ہے۔ ½۱۲ سے لے کر ½۱ تک کھانے کے لئے وقت ملتا ہے۔ اسی ایک گھنٹہ میں کلاس سے MESS تک آنے جانے میں بھی وقت لگتا ہے اور اس میں سے وضو اور نماز کے لئے بھی وقت نکالتا ہوں، لیکن بہت ہی دقت ہوتی ہے۔ عصر کے لئے سرے سے وقت ملتا ہی نہیں، کیونکہ فرصت ½۴ بجے ہوتی ہے اور ½۴ بجے سے ۵ بجے تک ناشتہ ہوتا ہے اور ۴ بج کر ۴۴ منٹ پر مغرب ہو جاتی ہے۔ ناشتہ کے فوراً بعد مغرب تو ادا کر لیتا ہوں، لیکن عصر رہ جاتی ہے۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ظہر اور عصر اور مغرب اور عشا کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کا قاعدہ کیا ہے۔ ووکنگ مسجد کے امام صاحب بعض اوقات نمازوں کو ملا کر پڑھتے ہیں۔

یہاں ہم بارہ طلبا آئے ہوئے ہیں جن میں سے مجھ سمیت کل پانچ لڑکے ایسے ہیں جو دین کا لحاظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اور بقیہ ایسے ہیں کہ ہم کو طرح طرح سے بیوقوف بناتے ہیں۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ میں ان باتوں سے کبھی نہیں گھبراتا بلکہ صحیح بات معلوم کر کے اس پر عمل بھی کرنا چاہتا ہوں اور دوسروں کو دلائل سے جواب بھی دینا چاہتا ہوں۔ ان مسائل پر میں نے ہمیشہ اللہ کو حاضر و ناظر جان کر غور کیا ہے اور اس سے ہمیشہ یہی توقع رکھی ہے کہ وہ مجھے ضرور صحیح راستے کی طرف ہدایت دے گا، مگر لغزش کی کمزوریوں کی وجہ سے ڈرتا ہوں کہ کوئی غلط صورت نہ اختیار کر بیٹھوں۔ اس لئے آپ سے یہ سوال کر رہا ہوں۔

جواب:

آپ نے جن مسائل کے متعلق میری رائے دریافت کی ہے ان کے بارے میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔

(۱) ذبیحہ کی صحت کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ جانور کی شہ رگ کاٹ کر خون نکال دیا جائے

بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر خدا کا نام لیا جائے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ "وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ۔ "جس پر خدا کا نام نہ لیا گیا ہو اسے نہ کھاؤ"۔ اب یہ ظاہر ہے کہ انگلستان میں جو جانور قتل کئے جاتے ہیں ان پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا، اس لئے ان کے حلال ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سورۂ مائدہ میں "طعام اہلِ کتاب" کو ہمارے لئے جائز قرار دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو چیزیں خدا نے ہمارے لئے ناجائز ٹھیرائی ہیں انھیں بھی ہم اہلِ کتاب کے ہاتھ سے لے کر کھا سکتے ہیں۔ اس بنا پر میرے لئے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ البتہ آپ کو اپنی خوراک کے معاملے میں جو مشکل پیش آرہی ہے اس کا حل ضروری ہے۔ سو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ آپ غیر لحمی یا نباتی غذا (VEGITERIANDIET) پر اکتفا کریں جس کا انتظام انگلستان میں ہو سکتا ہے، اور اگر گوشت کو کوئی ٹکڑا اس میں نکل آئے تو کھانے سے منتظم سے اس کی شکایت کر کے اس کا سدِ باب کرائیں۔ دوسرے یہ کہ وہم کو دل سے نکال دیں۔ جو چیز آپ کے سامنے دسترخوان پر پیش ہو اس میں اگر کوئی حرام شئے موجود نہ ہو تو اسے اطمینان کے ساتھ کھا لیجئے اور اس اندیشے سے اپنے ذہن کو پریشان نہ کیجئے کہ اس میں کسی حرام کھانے کا چمچہ ڈال دیا گیا ہوگا، یا اس میں کسی حرام جانور کی چربی شامل کر دی گئی ہوگی۔ آپ کو اپنے عمل کی بنیاد علم اور یقین پر رکھنا چاہئے نہ کہ گمان اور اندیشے کی بنا پر۔ آپ صرف اس غذا سے پرہیز کریں جس میں کسی حرام چیز کے شمول کا آپ کو علم ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ جب کبھی گوشت کو دل چاہے تو مچھلی پکوالیں، یا یہودیوں کا ذبیحہ حاصل کریں جن کا ملنا انگلستان میں مشکل نہیں ہے۔

(۲) نمازوں کے بارے میں جس مشکل کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کا حل یہ ہے کہ ظہر کی نماز میں اگر سنتیں ادا کرنے کا وقت نہ مل سکے تو صرف فرض پڑھ لیا کریں، اور عصر کے لئے وقت ملنے کی اگر کوئی صورت ممکن نہ ہو تو مغرب کے ساتھ قضا پڑھ لیا کریں۔ دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کے معاملے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ظہر اور مغرب کے آخر وقتوں میں عصر کو ظہر کے ساتھ اور عشاء کو مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھا جا سکتا ہے۔ اور دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک وقت کی نماز کے ساتھ دوسرے وقت کی نماز پیشگی بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس بات پر قریب قریب تمام علمائے اہلِ سنت نے ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی شخص دو وقت کی نمازوں کو ملا کر پڑھنے کی عادت بنا لے۔ کیونکہ اس طرح تو عملاً پانچ وقت کے

تین وقت ہی بن کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا آپ اس سے تو پرہیز کریں۔ البتہ جب کبھی عصر کی نماز پڑھنا ممکن نہ ہو، اسے قضا پڑھ لیا کریں۔

مجھے افسوس ہے کہ ہماری حکومت جن لوگوں کو تعلیم و تربیت کے لئے باہر بھیجتی ہے ان کی مذہبی ضروریات کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرتی۔ اگر سرکاری طور پر اس کی فکر کی جاتی تو انگلستان میں ہمارے طلبا کے لئے حلال غذا کا بھی انتظام ہو سکتا تھا اور نمازوں کے لئے بھی ان کو وقت دلوایا جا سکتا تھا۔

(ا-م)

اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کے لئے قرآن کا طرزِ بیان

سوال:

آپ کا مضمون بعنوان "ادب اور اخلاقی اقدار" جو ماہنامہ یثرب (شمارہ ستمبر و اکتوبر) میں شائع ہوا میری نظر سے گزرا۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اخلاقی اقدار کو لٹریچر میں پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ وہی ہے جو قرآنِ حکیم نے اختیار کیا۔ قرآنِ حکیم حُسنِ کلام اور تاثیرِ کلام کا سب سے مکمل نمونہ ہے، ہمیں چاہیئے کہ قرآنِ حکیم نے انسانیت کو سنوارنے کے لئے لٹریچر میں اخلاقی اقدار کو جس طرح پیش کیا ہے، اس طرزِ بیان کو اختیار کریں۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کے لئے قرآن کا طرزِ بیان کونسا ہے؟

جواب:

قرآنِ حکیم اخلاقی اقدار کو فلسفۂ اخلاق کی زبان میں پیش نہیں کرتا، بلکہ حکایات، تمثیل، تشبیہ و استعارہ، تعریف، زجر و توبیخ اور وعدہ وعید کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ اس طرزِ بیان سے انسان کا نفس بھی متاثر ہوتا ہے ذہنیت بھی بنتی ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف میں وہ ایک تاریخی قصے کے پیرائے میں بہت سے لیکچر ایسے طریقے بیان کرتا ہے کہ خود بخود انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کا اخلاقی نمونہ انسانیت کا

بلند نمونہ ہے، اور اس کے مقابلے میں برادرانِ یوسفؑ، امرأۃ العزیز، زنانِ مصر اور حکامِ مصر تصویر انسانیت کے برے نمونے ہیں۔ یہ چیز آپ سے آپ چند اخلاقی قدروں کو انسان کے ذہن میں جاگزیں کر دیتی ہے اور ان کا اثر فلسفیانہ زبان کی بہ نسبت زیادہ گہرا ہوتا ہے۔

یہ تاریخی قصہ جس ماحول میں بیان کیا گیا تھا، اس پر یہ پوری طرح منطبق بھی ہو رہا تھا اور اس کے نزول کے وقت میں اس طرح کے سارے کردار عملاً موجود تھے جن کی اس قصے میں کوئی حصہ داری تھی۔ سورۂ یوسف کے آئینے میں دراصل قرآن نے اہلِ مکہ کو ان کی صورتیں دکھلانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔

پھر قرآن میں انسان کے اخلاقی کرداروں کو تمثیلی پیرایہ دے کر جابجا اس طرح سامنے لایا گیا ہے کہ بعض اخلاقی قدروں کی اہمیت اور بعض کا قابلِ نفرت ہونا پوری طرح محسوس ہو جاتا ہے۔ کسی خاص طرز کی انسانی سیرت کو مرئی شکل میں سامنے لانے کے لئے جو مثالیں قرآن میں مذکور ہیں ان میں سے ایک سورۂ اعراف میں ہے۔ یہاں دکھایا گیا ہے کہ ایسے لوگ جو آیاتِ الٰہی سے منہ موڑ کر اپنی ہوائے نفس کی رو میں بہے چلے جاتے ہیں ان کے کیرکٹر کی تصویر کیا ہے۔ فرمایا: فمثله كمثل الكلب ج ان تحمل عليه يلهث او تتركه يلهث ہ یعنی ہوا پرست آدمی اپنی اخلاقی ذہنیت کے اعتبار سے ایک کتے کی طرح ہوتا کہ جس کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے اور نہ جس میں غیرت و حمیت ہی ہوتی ہے، اسے دھتکاریئے تو بھی زبان لٹکا دے گا اور اس سے نگاہ پھیر لیجئے تو بھی زبان لٹکائے رکھے گا۔ پھر اس تمثیل میں جس کردار کو بیان کیا گیا ہے اس کی زبان کو اتنا نمایاں کر دیا گیا ہے کہ اس سے خود بخود ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ کردار پیٹ کا بندہ ہے۔

ایک دوسری تمثیل سورۂ المدثر میں مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو: فما لهم عن التذكرة معرضين ؟ كأنهم حمر مستنفرة ، فرت من قسورة ۔ اس مختصر تمثیل سے ان مشرکینِ عرب کا کردار دکھانا مطلوب ہے جو دعوتِ حق سے خود بھی اعراض کئے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے دور بھگاتے تھے۔ اب قرآن نے استعارے کے طور پر ان کا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ جیسے کچھ گدھے جنگل میں چر رہے تھے کہ کچھ آواز (خاص طور پر شیر کی دہاڑ) ان کے کانوں میں پڑی، اور وہ بغیر سوچے سمجھے کہ آواز کیا ہے، کدھر سے آ رہی ہے، بدک کر اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے، اور اس انداز سے بھاگے کہ بس جو ملا اسے بھی خوف و اضطراب کی حالت میں مبتلا کر کے ساتھ لے

یہ تمثیل دراصل گدھے کی جن صفات کو سامنے رکھ کر پیش کی گئی ہے ان میں سے ایک صفت حمق کی ہے، یعنی گدھا جانوروں میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ حواس سے پوری طرح کام نہیں لیتا۔ دوسری صفت ڈر نے اور بدکنے کی ہے کہ ذرا کھٹکا ہوا اور اس نے کان کھڑے کر لئے۔ تیسری صفت بھاگ کھڑے ہونے کی ہے کہ خطرے کا سامنا کرنے یا پیش آمدہ صورت سے نمٹنے کے بجائے اس کا طریق کار ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ شور مچاتا ہوا اس طرح بھاگے گا کہ اس کا انداز دوسرے ساتھیوں کو بھی بھاگنے کی دعوت دینے والا ہو۔

تمثیل میں یہ اشارہ لطیف چھپا ہوا ہے کہ جس طرح شیر کی آمد پر گدھے کا اندھا دھند بھاگ کھڑے ہونا ذریعۂ نجات نہیں ہے، بلکہ اگر شیر تعاقب کر رہا ہے تو وہ بہرحال آ ہی لے گا، اسی طرح مشرکین جس دعوت پر غور کئے بغیر اس سے بھاگے پھر رہے ہیں وہ ایک دن ان کو آ لے گی۔

قرآن کے انداز بیان میں ایک پہلو یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ نفسِ انسانی کا تجزیہ کر کے اس کے چور دریچے ...... پھر وہ مختلف اخلاقی قدروں کو کرداروں کے پیرائے میں لا کر ان کا تقابل کرتا جاتا ہے۔ پھر وہ ماضی کے واقعات کو حال پر چسپاں کرتا ہے۔ پھر وہ مستقبل (خصوصاً عالمِ آخرت) کو حال بلکہ ماضی بنا کر دکھاتا ہے تاکہ مخاطب کا ذہن پیش آنے والے احوال کو زیادہ آسانی سے قبل از وقت سمجھ سکے۔

اس طرح اگر قرآن کے طرزِ بیان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ طرز بیان نہ تو فلسفیانہ ہے نہ مناظرانہ بلکہ اعلیٰ درجے کا ادبی طرزِ بیان ہے۔ (ن۔ ص)

قرآن میں چوری کی سزا

سوال:

اس خط کے ہمراہ ایک مضمون "قرآن میں چوری کی سزا" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ اگر مناسب ہو تو آپ اسے اپنے ماہنامہ میں شائع فرما دیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ مختلف لوگ اس پر اظہار خیال کریں۔ اور اگر آپ ...... میرے ساتھ متفق ہوں تو پھر زنا کے جرم کے بارے میں بھی اسی طرح کی تشریح کی جائے۔

مجلسِ دستور سازِ پاکستان کے سامنے زنا اور چوری، دو فوجداری جرم ایسے ہیں جن کی شرعی سزا موجودہ رجحانات کے خلاف ہے۔ میرے مضمون کا منشاء یہ ہے کہ مجلس مذکورہ کے لئے یہ ممکن ہو جائے کہ وہ اپنے قانون کو ایک طرف قرآن کی سزاؤں کے مطابق بنا سکے اور دوسری طرف لوگوں کے خیالات کا لحاظ بھی رکھ سکے۔ جہاں تک ہو سکے کسی جرم میں قید کی سزا نہ دی جائے اور بید، جرمانہ، جلاوطنی وغیرہ سزاؤں کو رواج دیا جائے تو یہ عین قرآن کے منشاء کے مطابق ہوگا۔

نوٹ:۔ جناب سائل کے محولہ بالا مضمون کے چند ضروری اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ یہ اقتباس اخبار پیغام صلح مورخہ یکم نومبر ۱۹۵۰ء کے تراشے سے لئے گئے ہیں جو خط کے ساتھ موصول ہوا ہے۔ (ن۔ ص)

"اس آیت (سورۂ مائدہ ـــ ۳۸، ۳۹) میں چوری کے جرم کی سزا بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ چوروں کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ السارق کے ساتھ السارقہ کے لفظ سے تمام مفسرین نے یہی سمجھا ہے کہ اس سے مراد چور عورت ہے" ـــــــ "مگر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی نوعِ انسان کے لئے کسی انعام یا سزا کا ذکر کرتا ہے تو شاذ و نادر حالتوں کے بغیر صرف مذکر کے لئے کرتا ہے اور مؤنث خود بخود اس میں شامل سمجھی جاتی ہے" ـــــــ "حقیقت یہ ہے کہ یہاں سارقہ سے مراد چور کا معین و مددگار ہے۔ دنیا میں دو قسم کے آدمی ہیں: ایک وہ جو کام کر رہے ہیں اور دوسرے وہ جو ان کے مددگار ہیں۔ مرد اور عورت میں سے بالعموم مرد کام کرنے والا ہوتا ہے اور عورت اس کی مددگار ہوتی ہے۔ اس لیے مددگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مؤنث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید نے بالعموم جہاں کہیں کسی کام یا نتیجہ میں مرد کے ساتھ عورت کا صیغہ استعمال کیا ہے وہاں ہمیشہ اس سے مراد اس کام میں معین و مددگار رہی ہے، خواہ وہ عورت ہو یا مرد۔ فعلِ زنا میں مرد کا پہلا مددگار زانیہ ہوتی ہے اور دوسرا مددگار وہ دلال ہوتے ہیں جو بیچ میں پیغام رسانی کر کے اسے وقوع میں لاتے ہیں اور تکمیل کراتے ہیں۔ اسی لئے زانیہ کے لفظ میں وہ سب شامل ہیں۔ اسی طرح چوری کا کام بالعموم انجام نہیں پا سکتا، جب تک تاڑ بازی کرنے والے، چور کے پناہ دہندہ اور چوری کے مال کے چھپانے والے نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے سارقہ کے لفظ میں ان سب کو شامل کیا ہے، اور سب کے لئے

ایک ہی سزا یعنی ہاتھ کاٹنا مقرر کی ہے"۔۔۔۔۔۔ "یہ بات کہ یہاں سارقہ سے چور کے مددگار مراد ہیں، اس سے بھی ظاہر ہے کہ سارق اور سارقہ کے درمیان واؤ کا لفظ لایا گیا ہے۔ حالانکہ اگر مراد چور عورت ہوتی تو واؤ کے بجائے اَوْ کا لفظ ہوتا"۔۔۔۔۔۔ "دوسری بات جو یہاں قابلِ غور ہے، یہ ہے کہ اللہ نے چور کو سچی توبہ کرنے کی مہلت دے کر سزا سے معاف فرمایا ہے، حالانکہ اسلامی فقیہوں کی تعزیرات میں معافی کوئی ذکر نہیں" (اس موقع پر توبہ کے بارے میں چند احادیث نقل کی گئی ہیں۔ ن-ص) "پس میری رائے یہ ہے کہ قرآن کی رو سے چور کو سچی توبہ کرنے کا ایک دفعہ موقع ملنا چاہیئے۔ اگر باوجود توبہ کے وہ پھر چوری کرے تو اس کو ضرور سزا ملنی چاہیئے"۔۔۔۔۔۔ "قرآن جب ایک طرف چور کی معافی کا ذکر کرتا ہے اور دوسری طرف ہاتھ کاٹنے کا حکم دیتا ہے تو اس کا منشا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ چوری کے لئے کم سے کم سزا یعنی معافی سے لے کر زیادہ سے زیادہ سزا یعنی ہاتھ کاٹنا بتاتا ہے۔ اس واسطے یہ کہنا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنے کے سوا کچھ نہیں، میرے نزدیک اصولِ قرآن کی غلط تعبیر کرنا ہے"۔۔۔۔۔۔ "قرآن کی رو سے قاضی کو چور اور اس کے مددگاروں کے بارے میں پورا اختیار حاصل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ وہ ان سے توبہ کرا کے بالکل کورا بھی چھوڑ سکتا ہے اور بید، جرمانہ، قید کی سزا بھی دے سکتا ہے۔ انتہائی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ اس تشریح کے ساتھ اس چیخ و پکار کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ قرآن کی سزائیں وحشیانہ سزائیں ہیں جو موجودہ متمدن دنیا میں قابلِ قبول نہیں"۔

جواب :

آپ نے چور کی سزا کے بارے میں جو استدلال فرمایا ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سارقہ اور زانیہ سے مراد سرقہ اور زنا میں مدد کرنے والے لینا محض ایک تکلف ہے جس کے لئے عربی میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اور اس طرح قرآنی الفاظ میں زبردستی ایک معنی پیدا کرنے کو میں جائز نہیں سمجھتا۔ رہی یہ بات کہ سارق کے ساتھ سارقہ کی تصریح کرنے کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت تھی؟ تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے معاملے میں سزا کی سختی کا تصور لوگوں کو ویسے ہی اچھا خاصا پریشان کرتا ہے، لیکن مرد کی بہ نسبت عورت کے حق میں یہ خیال اور بھی زیادہ پریشان کُن ہو سکتا ہے۔ اس لئے صراحت کی گئی کہ مرد ہی نہیں عورت بھی چور ہو تو اس کو ضرور یہ سزا

دی جائے۔ یہی مصلحت زانی کے ساتھ زانیہ کی تصریح میں بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔

واو عطف سے جو معنی آپ نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہیں۔ عربی زبان میں واو عطف محض معیت ہی کے معنی میں نہیں آتا کہ آپ لازماً اس کے معنی یہ کریں کہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں پر ایک ساتھ حکم جاری ہو۔ "واو" مطلق جمع کے لئے بھی آتا ہے اور اس سے مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ جو حکم بیان کیا جا رہا ہے اس میں معطوف اور معطوف علیہ دونوں یکساں ہیں۔ اس صورت میں اس کا فائدہ قریب قریب وہی ہوتا ہے جو "او" کا ہے، یعنی خواہ معطوف یا معطوف علیہ، دونوں میں سے جو بھی ہو اس کو وہی حکم پہنچتا جو بیان کیا گیا ہے۔ اسی لئے تو آیت فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ کا مطلب آپ یہ لیتے ہیں کہ دو دو یا تین تین، یا چار چار، نہ کہ یہ سب ایک ساتھ لہذا السارق والسارقۃ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں پر یہی قطع ید کا حکم جاری ہوگا۔

چور کی توبہ کے معاملے میں آپ نے جو بحث فرمائی ہے اس میں آپ یہ بھول گئے ہیں کہ آخر کونسا چور ہوگا جسے اگر سزا سے بچنے کی امید ہو تو وہ توبہ نہ کرلے گا؟ اور آپ کس جگہ یہ حد مقرر کریں گے کہ اتنی بار توبہ کر لینے پر بھی جو شخص چوری سے باز نہ آئے تو پھر اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟

آپ کا یہ سوال بھی صحیح نہیں ہے کہ چوری اور زنا میں مدد کرنے والوں کے لئے قرآن میں کیا سزا مقرر کی گئی ہے؟ ایک ہی معاملہ کیا، قرآن میں تو قانونِ تعزیرات کی بہت سی دفعات کے بارے میں سکوت کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم یا تو ہر جرم کی سزا قرآن ہی سے نکالیں، یا پھر قرآن کے ذکر کردہ جرائم اور سزاؤں کے سوا کسی مجرم پر سزا نہ دیں؟ قرآن تو صرف حدود مقرر کرتا ہے۔ باقی رہا تعزیرات کا معاملہ، تو شریعت میں یہ مسلم ہے کہ اس باب میں حسبِ ضرورت احکام مدوّن کئے جا سکتے ہیں۔ (ا۔م)

مطبوعات

A GIDE TO THE DIVINE TRUTHS OF ISLAM.

مؤلفہ: محمد عبد اللہ راجپوت، ایم، اے۔
ملنے کا پتہ: ۹ مچینی روڈ، پشاور چھاؤنی۔
قیمت: مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

ایک سو چالیس صفحے کی اس انگریزی کتاب میں مؤلف نے اجمالاً اسلام کے ایمانیات، عبادات اور اخلاقی و معاشرتی اصولوں کو سادہ عقلی استدلال کے ساتھ پیش کیا ہے، مؤلف کے پیش نظر مقصد یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے کو اپنے دین سے جو ذہنی بُعد پیدا ہو گیا ہے اسے کم کیا جائے اور قوم کے نوجوانوں کو اُس دین کے متعلق جس سے وہ اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں کم از کم بنیادی معلومات بہم پہنچادی جائیں۔

مؤلف نے اس کتاب میں اسلام کے اصولوں کی تشریح و تعبیر جس طرزِ فکر کے تحت کی ہے وہ حسبِ ذیل معتبر کتابوں پر مبنی ہے:-

(۱) غنیۃ الطالبین (سید عبد القادر جیلانیؒ) (۲) احیاء العلوم الدین (امام غزالی) (۳) مشکوٰۃ المصابیح (شیخ ولی الدین محمد بن عبد اللہ تبریزی)

زبان آسان اور خصوصاً طلبار کے معیار کی ہے۔

طب قدیم اور طبِ جدید

مؤلفہ: ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ایم، بی، بی، ایس، گراھی شاہو۔ سیور روڈ۔ لاہور۔
قیمت درج نہیں ہے۔

جس طرح مذہبیات میں دیوبندی اور بریلوی وغیرہ مدارسِ فکر کے درمیان مدت سے مناظرانہ بحثیں جاری ہیں، اسی طرح ہمارے ہاں طب قدیم اور طبِ جدید کے درمیان برابر دماغی تصادم ہوتا رہتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس علمی و فنی اختلافِ فکر میں کاروباری رقابت کا خمیر بھی آملا ہے جس نے فضا بہت خراب کردی ہے۔

پیشِ نظر پمفلٹ میں ممتاز حسین صاحب نے طبِ جدید کی حمایت کرتے ہوئے طب قدیم کے علمبرداروں کے

اعتراضات کا بڑے سنجیدہ طریق سے جواب دیا ہے۔ آپ کے دلائل معقول اور انداز بیان بہت سنجیدہ ہے اور بہت سے پہلوؤں میں راقم الحروف کو ان سے اتفاق بھی ہے۔ اس امر سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے کہ طب قدیم اور طب جدید دونوں کا سرچشمہ یونانی علم الاعضا اور علم الادویہ ہی ہے، لیکن یونانی علم طبابت کا ارتقا مسلمانوں کے ہاں ایک خاص مدت تک جاری رہنے کے بعد ان کے سیاسی زوال کے ساتھ رک گیا، اور قرونِ مابعد میں اس علم کی پرورش مغرب کی فضاؤں میں ہوئی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی مقتدر اقوام کی حکومتوں کی سرپرستی میں جو علم وفن مسلسل ترقی کر کے عروج پر پہنچ چکا ہے، اس سے اسی علم وفن کی وہ شاخ کیسے آنکھوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے جو پس ماندہ مشرقی اقوام کے ہاں حکومتوں کی سرپرستی سے محروم پڑی سسک رہی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز صاحب نے پمفلٹ کی تمہید میں ایک دلچسپ سوال چھیڑا ہے کہ اسلامی نظام حکومت، اسلامی شرع اور اسلامی فقہ کی ترکیبیں تو بامعنیٰ ہیں لیکن "اسلامی طب" کی اصطلاح بے معنیٰ ہے، کیونکہ علوم وفنون کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے، لیکن یونانی طب کو جس معنیٰ میں اسلامی طب کہا جاتا ہے وہ اگر پیش نظر رہیں تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس اصطلاح کے اندر بھی کچھ معنویت موجود ہے۔ آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ طب کے دو شعبے "علم" اور "فن" اسلامی اور غیر اسلامی ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک علم کا تعلق ہے انسان کے بدن اور اعضا اور ادویات کے مطالعے میں ایک نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ موجودات محض مادہ کی ایک صورت گری ہیں، کسی باارادہ خالق کا کرشمۂ قدرت نہیں ہیں اور ان میں خواص اور حرکات اور تغیر وتبدل اور اثر وتاثر کے جو قوانین برسرِ عمل ہیں وہ بھی محض اندھی فطرت کی طرف سے مسلط کردہ ہیں، کسی "الٰہ" کی حکومت کا مظاہرہ نہیں ہیں۔ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ موجودات ایک خالق کی اسکیم کے تحت وجود میں آتے ہیں اور ایک "اللہ" کی حکمت ہے جو ان کے لئے قوانین بنانے والی ہے۔ اگر آپ بالکل ایک ہی علم حقائق کا ان دو مختلف نقطہ ہائے نظر سے مطالعہ کریں۔ - - - - - - - - - - اور ان کو دونوں مختلف نقطہ ہائے نظر سے قلمبند کریں تو ایک ہی علم پہلے نقطۂ نظر کے زیر اثر غیر اسلامی ہو جائے گا اور وہی علم دوسرے نقطۂ نظر کی وجہ سے اسلامی شمار ہوگا۔ یہ نہ خیال کیجئے کہ یہ محض نظری فرق ہوگا، جی نہیں! نقطۂ نظر کا یہی اختلاف انسان کے بارے میں آپ کے پورے طرزِ عمل کو بدل کے رکھ دے گا۔ پہلی قسم کا علم آدمی کو آپ کے سامنے ایک "ترقی

یافتہ حیوان" کی حیثیت سے لائے گا، اور دوسری قسم کا علم اسے آپ کے سامنے خدا کے ایک بندے اور اپنے ایک بھائی کی حیثیت سے پیش کرے۔ آج لوگ اسلامی علمِ طب کے نام سے جس علم کو موسوم کرتے ہیں اس کی تدوین میں جو مخصوص نقطۂ نظر اختیار کیا گیا تھا اس کی وجہ سے ہی اسے اسلامی علمِ طب کہا جاتا ہے! اسی طرح جہاں تک فن کا معاملہ ہے، دواسازی میں حرام و حلال کی حدود کا خاص لحاظ، معائنہ و تشخیص کے مراحل سے گزرتے ہوئے حیاداری کا اہتمام مریضوں اور ان کے تیمارداروں کے جذبات و احساسات کا احترام، معاوضۂ خدمات کی وصولی میں موکلوں کی مالی حالت کا پاس اور بجز اول تا آخر کاروباریت کے بجائے خدمت کی روح کا برسرِ عمل رکھنا نیز خدا کے سامنے جواب دہی کا احساس بیدار رکھنا، یہ وہ خاص روایات تھیں جن کو مسلم اطباء نے اپنے ہاں فروغ دیا اور انہی روایات کی وجہ سے ان کا فن اسلامی فن کہلایا چنانچہ اساتذہ اپنے شاگردوں کو فنِ طب کی تعلیم دیتے ہوئے متعلقہ اسلامی حدود اور آداب و اخلاق کا خمیر اس میں ملا دیتے تھے۔ پس ہماری رائے میں "اسلامی طب" بالکل بے معنیٰ اصطلاح نہیں ہے۔

طبِ قدیم جسے "اسلامی طب" کہا جاتا ہے، وہ مغرب کی جدید طب کے مقابلے میں ایک جداگانہ مکتبِ فکر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے اس مکتبِ فکر کی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے اگر اس طب کے حامی جدید طب سے بغیر کسی تعصب کے استفادہ کریں اور اپنی طب کو UP-TO-DATE بنانے کی کوشش کریں، یا دوسرے لفظوں میں جدید طب کو اپنے مکتبِ فکر کے مخصوص سانچے میں ڈھال لیں تو یہ ایک قابلِ یادگار کارنامہ ہوگا۔ لیکن یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے کہ جدید طب اور قدیم طب کے علمبرداروں کے درمیان حریفانہ مناظروں کے بجائے تعاون کی اسپرٹ کام کرنے لگے اور خاص طور پر حکومت اس معاملے میں براہِ راست دلچسپی لے۔

بہرحال جو پمفلٹ ہمارے سامنے ہے یہ دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

تفہیم القرآن کے متعلق ضروری اعلان

تفہیم القرآن کے متعلق شائقین کی طرف سے بار بار پوچھا جا رہا ہے کہ دیر کیوں ہو رہی ہے آپ کی بے چینی بجا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ناشر آپ سے زیادہ بے چین ہے اور اس کی طرف سے کوئی تاخیر نہیں ہے۔ تاخیر بعض غیر اختیاری وجوہ سے ہے، لیکن انشاء اللہ یہ تاخیر مفید ثابت ہوگی کیونکہ کتاب کی خوبیوں میں اضافہ کرنے کی تجاویز برابر اختیار کی جا رہی ہیں۔ ضروری تفصیلات درج ذیل ہیں:۔

جلد اول میں اضافہ پہلی جلد سابق اعلان کے بموجب سورۂ فاتحہ سے سورۂ مائدہ تک تھی، لیکن اب محترم مؤلف نے سورۂ انعام کا اس میں اضافہ فرما دیا ہے۔

کتابت پہلی جلد کی کتابت مکمل ہو چکی۔ دوسری جلد کی کتابت شروع کرا دی گئی ہے۔

تصحیح کاپیاں دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد مولانا کی خدمت میں لائی جاتی ہیں اور آپ پوری طرح ان کی آخری تصحیح فرماتے ہیں۔ اسی طرح پروف بھی اچھی طرح دیکھنے کے بعد آخری مرتبہ مولانا کے سامنے لائے جاتے ہیں۔

انڈکس پوری جلد کے مندرجات کے انڈکس کی تیاری مولانا نے اپنے ذمے لی ہے حالانکہ ان کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔

نقشے ضروری جغرافی نقشوں کی تیاری ایک خاص رفیق کے ذمے کی جا چکی ہے، ابھی کام ختم نہیں ہوا۔

کاغذ ایک ہزار جلد (قسم دوم) کے لئے کراچی سے کاغذ مل گیا ہے، بقیہ کاغذ انشاء اللہ فروری تک موصول ہو جائے گا۔ انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔

طباعت پریس میں صرف چند روز کے لئے فہرست رائے دہندگان (الیکشن) کی طباعت کے کام کی بھیڑ ہے۔ اس کام کے ختم ہوتے ہی جلد اول کی طباعت شروع ہو جائے گی۔

ترسیل جیسے کہ پہلے اعلان کیا جا چکا ہے، انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں کی فرمائشوں کی تعمیل اسی ترتیب سے ہوگی جس سے فرمائشیں موصول ہو رہی ہیں۔

شیخ قمر الدین پبلشر، گوجر گلی۔ اندرون موچی دروازہ۔ لاہور۔

کسی فرد یا جماعت کے نظریات کا براہ راست اور تفصیلی مطالعہ کئے بغیر

اسکے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا ناممکن ہے

مختلف دینی وملی مسائل میں «جماعت اسلامی» کا موقف اُسکے لٹریچر سے معلوم کیجئے

جماعت کی بنیادی دعوت اور نصب العین

دستور جماعت اسلامی -/۳/- جماعت اسلامی کی دعوت -/۶/- دعوت اسلامی اور اُسکے مطالبات -/۸/۱ تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں -/۶/- شہادت حق -/۶/-

جماعت کی پچھلی تاریخ (۴۱ء تا ۴۷ء)

روداد جماعت اسلامی: حصہ اول -/-/۱ حصہ دوم -/۱۴/- حصہ سوم -/-/۲
حصہ پنجم -/-/۲ حصہ متعلقہ خواتین -/۱۲/-

تقسیم ہند سے قبل جماعت کا سیاسی موقف

اسلام کا نظریہ سیاسی -/۸/- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ -/۸/-
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش ۳۸ء تا ۴۰ء حصہ دوم -/۸/۲ حصہ سوم -/۸/۲
مسئلہ قومیت -/۸/۱

پاکستان کے سیاسی مسائل میں جماعت کا مسلک

آزادی کے اسلامی تقاضے -/۴/- اسلامی قانون اور پاکستان میں اُسکے نفاذ کی عملی تدابیر -/-/۱ مطالبۂ نظام اسلامی -/۴/- اسلامی ریاست میں کارکنوں کی ذمہ داریاں اور اوصاف -/۱۴/- اسلامی ریاست میں شہریت اور اُسکے حقوق و فرائض -/-/۱ اسلامی ریاست میں اطاعت کے شرائط و حدود -/۱۰/-
اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق -/۱۴/-

☆

مکمل فہرست

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی لاہور

سے طلب فرمائیے